ماہنامہ ترجمان القرآن

فروری ۹۲ء

جاری کردہ :

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ، اچھرہ ۔ لاہور (پاکستان)

ترجمۂ قرآنِ مجید

مع مختصر حواشی

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

اس میں

مترجم نے قرآنِ حکیم کے متن اور تفہیم القرآن کے ترجمے کے ساتھ بہت مختصر حواشی درج کردیے ہیں تاکہ عام لوگ جو قرآن مجید کا سیدھا سادہ مفہوم سمجھنا چاہتے ہیں وہ ایک ہی جلد میں تفہیم القرآن کے خلاصے سے فائدہ اٹھاسکیں۔

سائز: ۲۳×۳۶/۱۶ ○ صفحات: ۱۵۸۴ ○ کاغذ: امپورٹڈ مکینیکل ○ قیمت: ۱۵۰/- روپے

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ

اردو بازار، لاہور

فون نمبر: [illegible]

پوسٹ بکس نمبر: ۱۴۴۳

جلد ۱۱۶ فروری ۱۹۹۲ء عدد ۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

جاری کردہ:

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ، اچھرہ، لاہور (پاکستان)

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

رجسٹرڈ نمبر ایل ؛ ۵۳۴۰

جلد ۱۱۶ فروری ۱۹۹۲ء شعبان ۱۴۱۲ھ عدد ۶

فہرست مضامین

رابطہ و ترسیل زر کے لیے: ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ۔ رحمٰن مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

فون نمبر: ۲۳۴۰۱۴ - ۲۳۶۶۶۵ پوسٹ بکس نمبر: ۱۴۴۳

فی پرچہ ۶ روپے زرِ سالانہ: ۶۰ روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ملک عبدالمجید پرنٹرز لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

اشارات

گزشتہ دو صدیوں سے پورا عالمِ انسانی مغرب کی تہذیب اور سیاست کی گرفت میں جکڑا ہوا ہے۔ مغرب کے سیاسی، تہذیبی، ثقافتی اور علمی استعمار نے مسلمانوں کو سب سے بڑھ کر اپنا شکار بنایا ہے، اور اسی لیے مسلمان اب تک اپنی حقیقی آزادیوں سے محروم ہیں۔ اور مسلسل محروم رکھنے کی سازشوں اور کاوشوں کی زد میں ہیں۔

بظاہر دنیا کے بیشتر اسلامی ممالک براہِ راست کسی استعماری قوت کے زیرِ تسلط نہیں ہیں۔ وسطی ایشیا کا جو وسیع مسلم علاقہ روسیوں کی غلامی میں تھا وہ بھی سیاسی طور پر آزادی کا اعلان کر چکا ہے، اور مشرقی ترکستان، اراکان، جزائرِ مندا ناؤ، فطانی جیسے علاقوں کو چھوڑ کر مراکش اور مشرقی یورپ سے لے کر مشرقی ترکستان اور انڈونیشیا تک کے مسلمان علاقے آزاد علاقے کہلانے لگے ہیں۔ مگر اس کے باوجود مغرب کی سیاسی و معاشی اور ثقافتی و تہذیبی برتری کی وجہ سے یہ سیاسی آزادیاں بے معنی ہیں۔ جہاں بھی مغرب کو یہ خدشہ لاحق ہوتا ہے کہ وہاں کے عوام اپنی معاشی، معاشرتی، سیاسی، ثقافتی زندگی کو اسلام کے زیرِ سایہ لانے کی سعی میں کامیاب ہو رہے ہیں وہاں کے بارے میں ان کے ہاں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگتی ہیں۔

برطانوی اور فرانسیسی استعمار نے مسلمانوں کے بڑے بڑے علاقے خالی تو کر دیے ہیں مگر ساتھ ہی یہ انتظام بھی کر گئے ہیں کہ ان کے جانے کے بعد ان کے تربیت یافتہ اور ان کی تہذیب میں پوری طرح رنگے ہوئے ان کے معتمد علیہ شاگرد ہی ان کی سابق کالونیوں کی باگ دوڑ سنبھالیں، وہاں کی تہذیب و ثقافت پر انہی کی چھاپ برقرار رہے، ان کی معاشرتی، اقتصادی پالیسیوں کو وہی کنٹرول کرتے رہیں اور اس طرح استعماری آقا اپنے گھر میں بیٹھ کر بھی ایک طرح کے ریموٹ کنٹرول کے ذریعے اپنی سابقہ کالونیوں پر بدستور حکومت کرتے رہیں۔ جیسے ہی انہیں محسوس ہوتا ہے کہ کسی جگہ ان کے سدھائے ہوئے شاگردوں کی تہذیبی، سیاسی اور معاشی گرفت

ڈھیلی پڑ رہی ہے' وہ فوراً اپنے سارے وسائل حرکت میں لے آتے ہیں۔ وہ اپنے طاقتور ذرائع ابلاغ کے ذریعے نئی ابھرنے والی ہر اسلامی طاقت کے خلاف تہذیب و تمدن سے عاری ہونے' دور جدید کے تقاضوں سے نابلد ہونے' ایک جدید ریاست چلانے کے نااہل ہونے' انسانی حقوق اور خصوصاً عورتوں کے حقوق کا دشمن ہونے کے جھوٹے پراپیگنڈے کا طوفان اٹھاتے ہیں' اور اس اسلامی قوت کو معاشی طور پر مفلوج کرنے کی سرتوڑ کوششیں کرتے ہیں۔

ان تمام حالات کو واضح کرنے کیلئے الجزائر' افغانستان اور پاکستان کے موجودہ حالات کا تجزیہ کافی ہے۔ ہم اس تجزیے سے یہ واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں کہ ان تینوں مسلمان ممالک میں مغربی استعماری طاقتوں کی موجودہ پالیسیاں اسی نہج پر چل رہی ہیں کہ مسلمان کبھی بھی اپنی آزاد مرضی کے مطابق اپنے معاملات کو اپنے مفاد اور اسلامی حدود کے اندر چلانے کے قابل نہ ہو سکیں۔

۲۶ دسمبر ۱۹۹۱ کو الجزائر کے انتخابی نتائج نے پوری دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ ایک اسلامی ملک کی انقلابی اسلامی تحریک نے انتخابات کے ذریعے اتنی بڑی فتح حاصل کرلی۔ اس سے پہلے جون ۱۹۹۰ کے بلدیاتی انتخابات میں بھی ہمارے ان بھائیوں نے عظیم الشان کامیابی حاصل کرتے ہوئے ۷۰ فیصد نشستیں حاصل کر لی تھیں۔ الجزائر کے بڑے بڑے شہروں کے بلدیاتی اداروں میں بھی اسلامی تحریک ہی کو بالادستی حاصل ہوئی تھی۔ ان نتائج کے فوراً بعد ہی یہ کوششیں شروع ہو گئی تھیں کہ اسلامی تحریکوں کو منتشر کرکے مختلف اسلامی گروہوں کو ایک دوسرے کے مدِ مخالف کھڑا کر دیا جائے۔ الجزائری فوج کے اعلیٰ افسر اس کام کیلئے مغربی طاقتوں کے آلۂ کار بنے۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ ایسی معلق اسمبلی وجود میں آجائے جس میں کسی ایک پارٹی کو واضح اکثریت حاصل نہ ہو۔ یہ مقصد حاصل کرنے کیلئے انہوں نے زیادہ سے زیادہ پارٹیاں رجسٹر کرانا شروع کر دیں' یہاں تک کہ حالیہ انتخابات میں ۴۹ رجسٹرڈ پارٹیوں نے حصہ لیا۔ فوجی حکمرانوں کو توقع تھی کہ بہت ساری پارٹیوں کو تھوڑی تھوڑی نشستیں مل جائیں گی تو فوج اپنی ریشہ دوانیوں کے ذریعے اپنی مرضی چلا سکے گی۔

محاذِ نجاتِ اسلامی (جبهة الانقاذ الاسلامي) کو اس بات کا پورا خدشہ تھا' اور بجا تھا' کہ انتخابات میں فوج' بیوروکریسی' لادینی عناصر اور ان کے بیرون ملک پشتیبان اپنی مرضی کے نتائج حاصل کرنے کی کوشش کریں گے اور انتخابی عمل میں حصہ لینے کے باوجود بھی محاذِ نجاتِ اسلامی کو اتنی بڑی طاقت بن کر نہیں ابھرنے دیا جائے گا کہ وہ الجزائر کے پورے نظام کو تبدیل کرکے اسلامی خطوط پر اس کی تنظیمِ نو کر سکے۔ اس خدشے کی وجہ سے محاذِ اسلامی کے اندر بھی دو آراء

پیدا ہو گئی تھیں۔ ایک مضبوط گروہ کی رائے یہ تھی کہ عام انتخابات سے پہلے صدارتی انتخابات کروائے جائیں تاکہ بعد میں الیکشن کے ممکنہ گھپلوں کا مداوا کیا جا سکے۔ یہ مطالبہ جب عوام الناس کی زبانوں پر بھی عام ہو گیا تو حکومت نے ۲۷ جون ۱۹۹۱ کو طے شدہ انتخابات ملتوی کر دیے اور محاذِ نجاتِ اسلامی کے ۸ مرکزی قائدین کو گرفتار کر لیا' جن میں جبہہ کے قائد عباسی مدنی اور ان کے نائب علی بلحاج بھی شامل تھے۔ ان کا جرم اس بات کا ادراک کر لینا ہی تھا کہ عام انتخابات کے نتائج اگر اسلامی قوتوں کے حق میں بھی ہو جائیں تب بھی اسٹیبلشمنٹ اور فوج کے مضبوط اداروں کی مخالفت کی صورت میں وہ وسیع' دینی' اسلامی' انقلابی اصلاحات نافذ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں گے۔

الجزائر کے اندر اور الجزائر کے باہر پائے جانے والے تحریکِ اسلامی کے ایک دوسرے طبقے نے جبہۂ انقاذ کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ فوج کے ساتھ کوئی بڑا تصادم مول لینے کے بجائے وہ انتخابات کے پر امن راستے کو ہی آزما کر دیکھیں کیونکہ اس کے نتیجے میں بہرحال ایک عوامی تائید تو حاصل ہوگی' کچھ نئے راستے نئے دریچے تو وا ہوں گے۔

۲۶ دسمبر کے انتخابی نتائج اس لئے بھی سب کے لئے حیران کن تھے کہ حکمرانوں نے ان سے مختلف نتائج حاصل کرنے کیلئے بظاہر مستحکم اور مؤثر منصوبہ بندیاں کی ہوئی تھیں۔ انہوں نے انتخابی حلقہ بندیاں یوں ترتیب دی تھیں کہ حکمران پارٹی کے زیرِ اثر علاقوں میں چھوٹے حلقے بنا کر اپنے حامی حلقوں کی تعداد خاصی بڑھا لی تھی' اور محاذِ نجاتِ اسلامی کے اثرات کے علاقوں میں بڑے بڑے حلقے بنا کر ان کے حلقوں کی تعداد کم کرنے کی کوشش کی تھی۔ انتخابی قوانین بھی ایسے تھے کہ ان سے اسلامی تحریک کے اثرات کو محدود کرنے کی امید بندھتی تھی۔ مگر ان تمام انتظامات اور تیاریوں کے علی الرغم پہلے ہی مرحلے میں ۴۳۰ نشستوں میں سے جن ۲۳۰ نشستوں کا فیصلہ ہو گیا' محاذِ نجاتِ اسلامی نے ان میں سے ۸۱ فی صد یعنی ۱۸۹ نشستیں حاصل کر لیں۔ اس کے مقابلے میں سوشلسٹ پارٹی نے ۲۵ اور حکمران پارٹی نے صرف ۱۶ نشستیں حاصل کیں ——— اب ۱۶ جنوری کو انتخابات کا دوسرا مرحلہ طے ہونا تھا۔ محاذِ نجاتِ اسلامی کو اکثریت حاصل کرنے کیلئے مزید صرف ۲۷ سیٹیں درکار تھیں' جن کا حصول ایک یقینی امر تھا۔ یہ نتیجہ دیکھتے ہی ملک کے اندر اور باہر تمام دشمن اسلام قوتوں نے پروپیگنڈے کا ایک طوفان کھڑا کر دیا۔ ساتھ ہی انہوں نے ان نتائج سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے قوت استعمال کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔

مغربی ذرائع ابلاغ نے میونسپل انتخابات کے بعد یہ لائن لی کہ یہ غیر مطمئن اور بے روزگار عوام کا معاشی ابتری اور سیاسی آمریت کے خلاف احتجاجی ووٹ ہے۔ اور اسلامی محاذ کے علاوہ دیگر قوتیں میدان میں تھیں ہی نہیں۔ جب اسلامی محاذ نے غیر منصفانہ انتخابی قوانین کے خلاف اور صدارتی انتخاب پہلے کرانے کے حق میں مہم چلائی' فوج نے مداخلت کی' اور ۲۷ جون کے انتخابات ملتوی کر دیئے گئے' تو انھی ذرائع ابلاغ نے ساری ذمہ داری اسلامی محاذ کے اوپر ڈال دی۔ وہ مسلسل اس پروپیگنڈے میں لگے رہے کہ اسلامی محاذ جمہوریت کا دشمن ہے' وہ انتخابات ہونے ہی نہیں دینا چاہتا' وہ جبرو تشدد سے ایک اسلامی ریاست بنانا چاہتا ہے' اس کے اثرات بہت محدود ہیں' اور وہ اپنی شکست کے خوف سے انتخابی قوانین کے خلاف مہم چلا رہا ہے۔

۲۶ دسمبر تک یہ مہم اسی طرح جاری رہی' یہاں تک کہ محاذ نے فیصلہ شدہ نشستوں میں سے ۸۱ فی صد نشستیں حاصل کر لیں۔ اب مغربی ذرائع ابلاغ نے محاذ اسلامی کی اس واضح فتح کو جمہوریت کی شکست قرار دے دیا۔ یورپین بزر جمہر اس دعوے کی وجہ یہ بتا رہے تھے کہ محاذِ نجات اسلامی نے انتخابی منشور میں یہ نعرہ لگایا تھا کہ "وہ کسی دستور کے پابند نہیں ہیں بلکہ وہ قرآنی احکامات کے پابند ہیں۔ وہ قرآن سے متصادم کسی دستور کو کوئی وقعت نہیں دیتے۔ انھیں اگر حکومت دے دی جائے تو وہ دستوری اور جمہوری طریقوں کے بجائے اپنے اسلامی منشور کے مطابق اسلامی معاشرہ قائم کرنے اور شریعت کا نظام قائم کرنے کے پابند ہوں گے"۔ جمہوریت کے کار پردازوں کی نظر میں یہ نعرہ' یہ پروگرام جمہوریت کے بنیادی اصولوں کے خلاف تھا۔

مغرب اور اس کے متبعین نے اپنے رویے سے یہ بات واضح کر دی کہ ان کے نزدیک جمہوریت خواہشِ نفس کی پیروی کا نام ہے۔ عوام کی اکثریت بھی اگر خواہشِ نفس کی پیروی کے بجائے ہدایاتِ ربانی کی پیروی کا فیصلہ و اعلان کر دے تو یہ بات جمہوریت کے منافی شمار ہوگی' اگرچہ دعویٰ پھر بھی وہ یہی کریں گے کہ جمہوریت عوامی اکثریت کا نام ہے۔

محاذِ نجات اسلامی کی موجودہ لیڈر شپ کو (جو جیل سے باہر ہے) الجزائر میں فوج کے اختیارات سنبھالنے' صدر شاذلی بن جدید کے استعفے اور انتخابات کے دوسرے مرحلے کے التواء کے فیصلے سے کوئی اچنبھا نہیں ہوا کیونکہ ان کو پہلے ہی یہ احساس تھا کہ اسلامی انقلاب جیسی بڑی اسلامی تبدیلی کو بآسانی قبول و برداشت نہیں کیا جائے گا۔ فوج کی مداخلت اور مرحلہ ثانی کے التواء کے بعد محاذ نجات اسلامی کے قائمقام صدر عبدالقادر حشانی سے ٹیلی فون پر ہمارا رابطہ ہوا تو انھوں نے انتہائی پر اعتماد و پرعزم لہجے میں کہا کہ دنیا بھر میں ہمارے دوستوں کو یہ خوشخبری سنا

وہ کہ آخری فتح انشاء اللہ اسلامی تحریک ہی کی ہوگی۔ اس کامیابی کی راہ میں جتنے مراحل بھی ابھی باقی ہیں ان سب کیلئے وہ پہلے بھی ذہنا" تیار تھے' اور اب بھی تیار ہیں۔

الجزائر کی اس تازہ مثال سے یہ بات بالکل واضح ہو گئی ہے کہ مغربی ممالک کا دعویٰ جمہوریت بالکل کھوکھلا ہے۔ وہ تو بس کسی نہ کسی طرح اپنا تہذیبی اور اقتصادی غلبہ برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ اسلامی تحریکیں ان کے بارے میں کتنا ہی محتاط رویّہ کیوں نہ اختیار کر لیں وہ ہرگز انہیں پھلتا پھولتا نہیں دیکھ سکتے۔۔۔۔ انتخابات جیتنے کے بعد محاذِ نجاتِ اسلامی نے مخالفانہ مظاہروں کے جواب میں جوابی مظاہروں سے مکمل احتراز کیا' اور واضح طور پر اعلان کیا کہ ہم انسانیت کی خدمت کے لئے اٹھے ہیں' دوستوں کے دوست ہیں' تمام بین الاقوامی معاہدوں کا احترام کرتے ہیں' ہم جو اصلاحات نافذ کرنا چاہتے ہیں ان اصلاحات میں پوری انسانیت کی فلاح مضمر ہے۔ انہوں نے اپنی روش اور زبان سے نہ کوئی اشتعال انگیزی کی' نہ کسی کو مشتعل ہونے کا موقع دیا۔ اور نہ ہی عوامی قوت و جذبات کو مشتعل کرنے کا راستہ اختیار کیا۔ انہوں نے پوری کوشش کی کہ پرامن و پرسکون طریقے سے انتخابی عمل پورا ہو جائے۔ مگر ان کی یہ تمام معتدل پالیسیاں ظالم مخالفوں کی بدنیتی کا مداوا نہ کر سکیں۔ الجزائر میں اس وقت دستور عملاً معطل ہے' اسمبلی توڑ دی گئی ہے' اختیارات عملاً چند جنرلوں کے ہاتھ میں ہیں اور مستقبل بے یقینی کی صورتحال سے دوچار ہے۔ لیکن سب کچھ کے باوجود اسلامی تحریکوں کو یہ کامل یقین ہے کہ اتنی بڑی عوامی تائید کے عملی مظاہرے کے بعد کسی طاقت کیلئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ مستقل طور پر ان کا راستہ روک سکے۔ محاذِ نجاتِ اسلامی نے عوام اور فوج دونوں سے اپیل کی ہے کہ وہ سازشیوں کے بُرے عزائم کو ناکام بنا دیں۔ ساتھ ہی اس نے عوام کو یہ اشارہ بھی دیا ہے کہ وہ اپنے حقوق کے تحفظ کی خاطر ہر طرح کی قربانیاں دینے کیلئے تیار رہیں۔ کہ دنیا و آخرت میں کامیابی کا راستہ اللہ کی راہ میں قربانیوں میں سے گزرتا ہے۔

الجزائر میں اسلامی تحریکوں کو جس بڑے پیمانے پر عوامی تائید حاصل ہوئی ہے اس سے دنیا بھر کی اسلامی تحریکوں میں یہ اعتماد پیدا ہوا ہے کہ مناسب حکمتِ عملی اختیار کرکے وہ ہر جگہ عوام کی بھرپور حمایت سے بہرہ ور ہو سکتے ہیں۔

الجزائری معاشرے کو فرانسیسیوں نے اپنے دورِ استعمار میں بری طرح مسخ کرکے رکھ دیا تھا۔ فرانسیسیوں کے بعد ان کے تربیت یافتہ الجزائری طبقہ اشراف Elite اور مراعات یافتہ وارثانِ فساد نے مغربی تہذیب کے اثرات پھیلانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ الجزائری عوام کو فرانس اور

اٹلی کے ٹیلیویژن سٹیشنوں کے ذریعے جو کچھ دکھایا جاتا ہے پاکستان میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن مغرب کے اس قدر گہرے اثرات کے باوجود راسخ العقیدہ مسلمان قیادت کی پرجوش' پرعزم اور پراعتماد تحریک نے الجزائر کی بہت بڑی اکثریت کو آغوشِ اسلام میں واپس لانے میں کامیابی حاصل کی اور تمام غیر منصفانہ انتخابی ہتھکنڈوں کے باوجود انتخابات کے ذریعے مثبت نتائج حاصل کئے۔ یہ کامیابیاں اس بات کی دلیل ہیں کہ انتخابی عمل سے مایوسی صحیح طرزِ فکر نہیں ہے۔ اگر انتخابات کے ذریعے مکمل انقلاب نہ بھی آئے تب بھی اس عمل سے گزرنا رائے عامہ کو ہموار کرنے کا مفید ذریعہ ہے۔

الجزائری تجربے سے یہ بات بھی عیاں ہوتی ہے کہ مغرب اور مسلمان ممالک میں براجمان مغرب کے حواری کبھی بھی اسلامی انقلاب کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کر سکتے۔ اگر خوش قسمتی سے کوئی حکمران شاذلی بن جدید کی طرح حقائق کو تسلیم کرتے ہوئے مثبت رویہ اپنا بھی لے تو اسے استعفے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ لیکن عوام الناس مقصدِ حیات کے حصول کی خاطر تمام خطرات کا مقابلہ کرنے کیلئے اٹھ کھڑے ہوں تو پھر یہ فرمانِ الٰہی آفتاب نصف النہار کی طرح دکھائی دینے لگتا ہے کہ "اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ وَیُثَبِّتْ اَقْدَامَکُمْ"۔ "اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم مضبوط جما دے گا"۔ پھر ہر مومن دل کو یہ خوشخبری دی جانے لگتی ہے کہ "وَیَنْصُرَکَ اللّٰہُ نَصْرًا عَزِیْزًا" اس نے تم کو کھلی فتح عطا کر دی تاکہ ...... "تم کو زبردست نصرت بخشے"۔

اسلام کے بارے میں مغرب کے بُرے عزائم کی دوسری مثال افغانستان کے حالیہ واقعات ہیں۔ افغان جہاد نے پوری عالمی تاریخ کا رخ تبدیل کر دیا ہے۔ جس زمانے میں افغانستان کی اسلامی تحریک نے کمیونزم کی پیش قدمی کے سامنے بند باندھنے کا فیصلہ کیا تھا اس وقت امریکہ ویتنام میں اپنی شکست کے زخم چاٹ رہا تھا' اس میں ہرگز یہ ہمت نہیں تھی کہ وہ کسی دوسرے محاذ پر روس کے بالمقابل آسکے۔ افغانستان کی اسلامی تحریک نے ظاہر شاہ کے دور حکومت میں ہی کمیونسٹوں کے خلاف جدوجہد شروع کر دی تھی۔ ظاہر شاہ نے بظاہر کمیونسٹوں اور اسلامی تحریک کے درمیان غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کیا تھا مگر فی الحقیقت وہ کمیونسٹوں سے اتنا خائف نہیں تھا جتنا خوفزدہ وہ اسلامی تحریک سے تھا۔ کمیونسٹوں کو تو وہ ایک موہوم سا خطرہ سمجھتا تھا' مگر اسلامی تحریک کو اصل خطرہ سمجھتا تھا۔ وہ کچھ عرصہ کمیونسٹ طلبہ اور تحریکِ اسلامی کے نوجوانوں کو ایک

دوسرے کا توڑ کرنے کیلئے استعمال کرتا رہا' مگر افغانستان میں روس کی ریشہ دوانیوں کو روکنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ نتیجتاً کیمونسٹوں کے حوصلے بڑھتے رہے' یہاں تک کہ انہوں نے داؤد کو آلہ' کار بنا کر افغانستان میں انقلاب برپا کر دیا۔ کچھ عرصے بعد جب انہوں نے محسوس کیا کہ داؤد ان کے اثرات سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہا ہے' تو وہ ۱۹۷۸ میں اسے ہٹا کر نور محمد ترہ کی کو لے آئے۔ پاکستان سمیت امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک نے اس کی حکومت کو تسلیم کر لیا۔ ہم نے ۱۹۷۸ کے کیمونسٹ انقلاب کے بعد کوشش کی تھی کہ جنرل ضیاء الحق مرحوم ترہ کی کے انقلاب کو تسلیم نہ کریں' اور اس کی حکومت مستحکم ہونے سے پہلے پہلے مجاہدینِ افغانستان کی مدد کرکے اس پر کاری ضرب لگانے پر آمادہ ہو جائیں۔ مگر کابل میں پاکستانی سفارت خانے کی رپورٹ کے مطابق مجاہدین کی مزاحمت عارضی اور چند روزہ تھی۔ ضیاء الحق مرحوم نے ہماری بات ماننے کے بجائے کابل میں پاکستانی سفارت خانے کی بات کو زیادہ اہمیت دی' اور یہ بھی کہا کہ امریکہ سمیت پورے مغربی بلاک اور اسلامی دنیا نے اسے تسلیم کر لیا ہے اس لئے صرف پاکستان کے لئے ممکن نہیں ہے کہ اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔

نور محمد ترہ کی کے خلاف اندرونی مزاحمت مسلسل بڑھتی گئی اور آخر کار کیمونسٹوں کے آپس میں اختلافات کی وجہ سے اس کی جگہ حفیظ اللہ امین نے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ روس کو اپنے قابلِ اعتماد مہرے کے اس طرح ہٹا دیے جانے پر غصہ آیا اور اس نے براہِ راست مداخلت کرکے حفیظ اللہ امین کو ہٹا کر ببرک کارمل کو لابٹھایا جو اس وقت روس میں تھا۔ روس کی اس براہِ راست مداخلت کے بعد امریکہ کو بھی فکر لاحق ہونے لگی۔ اب اسے یہ خطرہ بھی سامنے دکھائی دینے لگا کہ افغانستان کو تختہ٭جست بنا کر روس اچانک خلیج تک پہنچ سکتا ہے' اور اس طرح پوری دنیا کو تیل کے بحران میں مبتلا کرنے کی صلاحیت حاصل کر سکتا ہے۔ اگر افغانستان میں روس کو استحکام نصیب ہو جاتا تو اس وقت دنیا کا نقشہ بالکل مختلف ہوتا۔ تیل کے سرچشموں پر کنٹرول حاصل کرکے روس باآسانی اپنی اقتصادی مشکلات پر قابو پا سکتا تھا' اور مزید کچھ عرصے تک کیمونزم کی داخلی کمزوریوں کی پردہ پوشی کر سکتا تھا۔ اس عرصے میں وہ بحرِہند' جاپان اور یورپ میں اپنے اثرات کو مزید توسیع دے کر امریکہ کے بجائے خود پوری دنیا کا واحد پولیس مین بننے کا دعویدار بن سکتا تھا۔ مگر افغانوں نے تاریخ کو وہ رخ اختیار کرنے سے روک دیا۔ لیکن اب امریکہ یہ باطل دعویٰ کرنے لگا ہے کہ وہ پوری دنیا کی واحد سپرپاور ہے' دنیا کی تقدیر کا فیصلہ اسے ہی کرنا ہے۔ امریکہ یہ حیثیت اختیار کرنے کے بعد افغانستان کے مجاہد رہنماؤں کا اپنی سرزمین پر حکومت کرنے

کا حق بھی تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ افغانستان میں ایک اسلامی حکومت برسرِاقتدار آئے۔ اس کی کوشش ہے کہ افغانستان کو اس وقت تک باہمی جنگ و جدل کا شکار بنائے رکھے جب تک تمام افغان گروہ امریکہ کی مسلّط کردہ حکومت کو قبول نہ کرلیں۔ امریکہ نے اس گھناؤنے منصوبے کی خاطر اقوامِ متحدہ کے فارمولے کے ذریعے یہ لازم قرار دیا ہے کہ مختلف افغان فریق آپس میں بات چیت کریں' مختلف فریقوں سے اس کی مراد ہے نجیب اللہ' ظاہر شاہ اور مجاہدین۔ امریکہ چاہتا ہے کہ اس کھیل کی آڑ لے کر وہ اپنا من پسند حکمران افغانستان پر مسلّط کر دے' بالکل اسی طرح جس طرح پہلے روس اپنے کھلونوں کو وہاں مسلّط کرتا رہا ہے۔

بدقسمتی یہ ہے کہ اس پورے کھیل میں پاکستان' سعودی عرب اور ایران کے حکمران بھی اپنی اپنی مصلحت کی خاطر امریکہ کی پیروی کر رہے ہیں' حالانکہ یہ رویہ نہ صرف افغانستان کے ساتھ دغا اور بے وفائی بلکہ پاکستان کے مفاد کے بھی خلاف ہے۔ یہ پالیسی اختیار کرنا پاکستان کی ملّی اور قومی اُمنگوں کا خون کرنا ہے۔ امریکہ اگر اپنے مکروہ عزائم میں کامیاب ہوتا ہے تو ایک طرف تو افغانستان وسط ایشیا کے مسلمانوں کو قیادت فراہم کرنے کے تاریخی کردار سے محروم ہو جائے گا' اور دوسری طرف پاکستان بھارت اور افغانستان کی پاک مخالف حکومتوں کے درمیان سینڈوچ ہو جائے گا۔ پھر پاکستانیوں کی یہ تمنا کبھی بھی پوری نہیں ہو سکے گی کہ وہ افغانستان اور وسطی ایشیا کے مسلمانوں کا اتحاد حاصل کرکے اس علاقے سے بھارتی بالادستی کا خواب پریشان کردے اور کشمیری مسلمانوں کو ان کی آزادی سے ہمکنار کردے۔

امریکہ اور مغربی ممالک کے اسلام دشمن عزائم کا تیسرا کھلا مظہر پاکستان میں نظر آتا ہے۔ ابھی حال ہی میں امریکی سینیٹر پریسلر نے بھارت اور پاکستان کا دورہ کیا تو اسے نہ تو اسرائیلی یہودی بم نظر آیا نہ بھارتی ہندو بم دکھائی دیا۔ اسے دکھائی دیا تو پاکستان کا متوقع اسلامی بم۔ اس بم کا خطرہ اسے اس قدر سنگین لگا کہ پاکستان کی قوت اسے ایک عظیم اسلامی بلاک میں بدلتی دکھائی دی۔ اس نے کہا کہ پاکستان' افغانستان' ایران' ترکی اور وسطی ایشیا کے ۶ ممالک اگر مل گئے تو یہ ایک بڑا اسلامی بلاک ثابت ہوں گے جس کے پاس ایٹمی صلاحیت بھی ہوگی۔ مستقبل کی اس قوت سے دنیا کو فوری خطرہ لاحق ہے۔ بھارت خطرات میں گھر گیا ہے' وہ مسلمانوں کے دائرہ سطوت میں پھنس کر رہ جائے گا۔ اس نے یہ بھی کہہ دیا کہ امریکی امداد حاصل کرنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ پاکستان برسرِعام اپنی ایٹمی تنصیبات کو تباہ کردے۔ جب اس سے اخبار

نویسوں نے کشمیریوں کے بنیادی حقوق کے بارے* میں سوال کیا تو اس نے نہ صرف جواب دینے سے احتراز کیا بلکہ پریس کانفرنس سے اُٹھ کر چلا گیا۔

الجزائر' افغانستان اور پاکستان کے ان حالات سے یہ بات مکمل طور پر عیاں ہو جاتی ہے کہ مغربی ممالک کسی بھی طرح اسلامی ممالک کی مکمل آزادی برداشت نہیں کر سکتے۔ مسلمان عوام کو اپنی حقیقی آزادی سے ہم کنار ہونے کیلئے ایک طویل' پرعزم اور صبر آزما جدّوجہد کی ضرورت ہے۔ اب تو چار سُو مسلمان عوام میں بیداری کے آثار نظر آنے لگے ہیں۔ بڑی تعداد میں ایسی قیادت بھی موجود ہے جو مقصد کا گہرا شعور اور منزل کا صحیح ادراک رکھتی ہے۔ ان حالات میں مسلم تحریکوں کا فرض ہے کہ وہ لمبے عرصے کی درست منصوبہ بندی کریں' مغرب کی چالوں سے خبردار رہیں اور عام مسلمانوں کو ان سے آگاہ کرنے کیلئے مربوط کوششیں کریں' اپنے اپنے علاقوں اور اپنے ممالک میں مغرب کے پروردہ مراعات یافتہ طبقے کے مقابلے میں مسلمان عوام کو اپنا ہمنوا بنائیں۔ دنیا بھر کے مسلم عوام جب یکبارگی اپنے اپنے علاقوں میں ہر طرف سے اٹھ کھڑے ہوں گے تو انھیں یقیناً تائید الٰہی حاصل ہوگی اور سازشیوں کی سازشیں دھری کی دھری رہ جائیں گی۔ یہ مستقبل کا نوشتہ دیوار ہے جسے ہر صاحبِ بصیرت پڑھ سکتا ہے۔

وَنُرِيدُ أَن نَّمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ ۝ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ ...... (القصص - ۵)

"اور ہم یہ ارادہ رکھتے تھے کہ زمین پر ذلیل بنا کر رکھے گئے لوگوں پر مہربانی کریں اور انھیں پیشوا بنا دیں اور انھی کو وارث بنائیں اور زمین میں ان کو اقتدار بخشیں"۔

حکمتِ مودودیؒ

اسلامی انقلاب کا لازمی ابتدائی مرحلہ اور اس کے تقاضے

ہماری تحریک اور دوسری تحریکوں کا فرق

اکثر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے ارکان کو اپنی تحریک اور دوسری تحریکوں کے فرق کا پورا شعور نہیں ہے۔ حالانکہ اس فرق کو اچھی طرح سمجھ لینے کی ضرورت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تحریک عام تحریکوں سے بنیادی اختلافات رکھتی ہے۔ اولاً" یہ کہ اس کے سامنے پوری زندگی کا مسئلہ ہے' زندگی کے کسی ایک پہلو کا نہیں۔ ثانیاً" یہ کہ خارج سے پہلے یہ باطن سے بحث کرتی ہے۔ جہاں تک پہلے پہلو کا تعلق ہے ہمارے سامنے کام اتنا بڑا اور اہم ہے جو اسلامی تحریک کے سوا دنیا کی کسی تحریک کے سامنے نہیں ہے اور ہم اس جلد بازی کے ساتھ کام نہیں کر سکتے جس جلد بازی سے دوسرے کر سکتے ہیں۔ پھر چونکہ ہمارے لئے خارج سے بڑھ کر باطن اہمیت رکھتا ہے اس وجہ سے محض تنظیم اور محض ایک چھوٹے سے ضابطہ بند پروگرام پر لوگوں کو چلانے اور عوام کو کسی ڈھرے پر لگا دینے سے ہمارا کام نہیں چلتا۔ ہمیں عوام میں عمومی تحریک (Mass-Movement) چلانے سے پہلے ایسے آدمیوں کو تیار کرنے کی فکر کرنی ہے جو بہترین اسلامی سیرت کے حامل ہوں اور ایسی اعلیٰ درجہ کی دماغی صلاحیتیں بھی رکھتے ہوں کہ تعمیرِ افکار کے ساتھ اجتماعی قیادت کے دوہرے فرائض کو سنبھال سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں عوام میں تحریک کو پھیلا دینے کے لئے جلدی نہیں کر رہا ہوں بلکہ میری تمام تر کوشش اس وقت یہ ہے کہ ملک کے اہلِ دماغ طبقوں کو متاثر کیا جائے اور ان کو کھنگال کر صالح ترین افراد کو چھانٹ لینے کی کوشش کی جائے جو آگے چل کر عوام کے لیڈر بھی بن سکیں اور تہذیبی و تمدنی معمار بھی۔ یہ کام چونکہ ٹھنڈے دل سے کرنے کا ہے اور ایک عمومی تحریک کی طرح فوری ہلچل اس میں نظر نہیں آسکتی' اس وجہ سے نہ صرف ہمارے ہمدرد و ہم خیال لوگ بلکہ خود ہمارے ارکان تک بد دل ہونے لگتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ارکانِ جماعت کام کے اس نقشہ کو اچھی طرح سمجھ لیں

اور اپنی قوتیں بد دلی کی نذر کرنے کے بجائے کسی مفید کام میں استعمال کریں۔

ہمارے پیشِ نظر نقشۂ کار

یہ اعتراض بجا ہے کہ کثیر التعداد عوام کو اس نقشہ کے مطابق بلند سیرت بنانے کے لئے مدت مدید درکار ہے۔ مگر ہم اپنے انقلابی پروگرام کو عوام کی اصلاح کے انتظار میں ملتوی کرنا نہیں چاہتے۔ ہمارے پیشِ نظر صرف یہ نقشہ ہے کہ عوام کی سربراہ کاری کے لئے ایک ایسی مختصر جماعت فراہم کر لی جائے جس کا ایک ایک فرد اپنے بلند کیریکٹر کی جاذبیت سے ایک ایک علاقہ کے عوام کو سنبھال سکے۔ اس کی ذات عوام کا مرجع بن جائے اور کسی مصنوعی کوشش کے بغیر بالکل فطری طریقہ سے عوام کی لیڈر شپ کا منصب اسے حاصل ہو جائے۔ مگر صرف مرجعیت سے بھی کام نہیں چل سکتا اُس سے کام لینے کے لئے دماغی صلاحیتیں بھی ہونی چاہئیں تا کہ ان مرکزی شخصیتوں کے ذریعہ سے عوام کی قوتیں مجتمع اور منظم ہو کر اسلامی انقلاب کی راہ میں صرف ہوں۔ ایک ٹھوس' پائیدار اور ہمہ گیر انقلاب کا لازمی ابتدائی مرحلہ یہی ہے۔ اس مرحلہ کو صبر سے طے کرنا ہی پڑے گا۔ ورنہ تحریک کی تباہی ناگزیر ہے۔ اگر موجودہ حالات میں عوام کو اکسا دیا جائے جب کہ عوام کو سنبھال کر لے چلنے والے مقامی رہنما موجود نہیں ہیں تو عوام بالکل بے راہ روی پر اتر آئیں گے اور اپنے آپ کو نا اہل لوگوں کے حوالے کر دیں گے۔"

"عمومی تحریک (Mass- Movement) کے آغاز سے پہلے چند تعمیری کام کر لینے ضروری ہیں۔

ایک یہ کہ ہم اپنے تعلیمی پروگرام کی بنا ڈال دیں' کیونکہ ضروری نہیں کہ ہم اپنی زندگی میں اپنے نصب العین تک پہنچ جائیں۔ اس لئے ہمیں ابھی سے یہ فکر کرنی چاہیے کہ ہم اپنی جگہ اپنے سے بہتر کام کرنے کے لئے آئندہ نسل کو تیار کرنا شروع کر دیں۔

دوسرے ہمیں اہلِ قلم کا ایک ایسا لشکر تیار کر لینا چاہیے جو علوم و فنون اور ادب کے ہر پہلو سے نظامِ حاضر پر حملہ آور ہو سکے۔ کچھ سیاسی مفکر ہوں جو حال کی کافرانہ سیاست کے مکروہ خدوخال کو خوب نمایاں کریں' کچھ معاشی ماہرین ہوں جو رائج الوقت معاشی تنظیم کے عیوب کو کھولیں' کچھ علمائے قانون کی ضرورت ہے جو انسانی قوانین کی بے اعتدالیوں کو نمایاں کریں' اخلاق و نفسیات کے کچھ حکماء چاہئیں جو عہدِ حاضر کے علم النفس اور علم الاخلاق کی کوتاہ بینیوں کی نشان دہی کریں' اور اس تخریبی کارروائی کے ساتھ یہ لوگ علوم کی نئی تدوین کا تعمیری کام بھی سنبھالیں۔ ان مجتہد مفکرین کو مدد بہم پہنچانے کے لئے ادیبوں' افسانہ نگاروں اور ڈرامہ نویسوں کا

ایک گروہ بھی ضرور ہونا چاہیے جو فکری میدان کار زار میں "گوریلا وار" لڑتا ہے۔

تیسرا تعمیری کام ہمیں یہ کرنا ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے عمومی تحریک کو چلانے کے لئے کارکنوں اور رضا کاروں کی تربیت کی جائے۔ ہمیں مقرروں سے لے کر خاموش کارکنوں تک بالکل نئی وضع کے کارندے درکار ہیں جن کے اندر خشیۃ اللہ کی روح جاری و ساری ہو۔ ان تین شعبوں میں جس کم سے کم تعمیری کام کی ضرورت ہے اس کو انجام دینے سے پہلے یہ توقع نہ رکھنی چاہیے کہ ہم عوام میں انقلابی دعوت پھیلانے کے لئے کوئی کامیاب اقدام کر سکتے ہیں۔"

(اقتباس از خطاب اجتماع ارکان منعقدہ ۲۱ اکتوبر ۴۵ء بمقام دربھنگہ۔ روداد جماعت اسلامی (حصہ اول)

بقیہ : ایک علمی محاکمہ

عوام میں حاکم اور محکوم کا نہیں بلکہ خادم اور مخدوم کا رشتہ تھا اور دوسرا وہ جو آئرلینڈ میں نافذ تھا اور جہاں انگلستان کی حیثیت حاکم اور آئرلینڈ کے لوگوں کی حیثیت ایک قسم کے غلام کی تھی۔ ۱۸۶۱ء کے پولیس ایکٹ میں آئرلینڈ کے ماڈل کو اصل ماخذ بنایا گیا ہے۔ ستم ظریفی ہے کہ محکوم ہندوستان میں بھی چونکہ تین شہروں میں انگریز رہتے تھے اس لیے ان شہروں کے لیے پولیس ایکٹ میں خصوصی تبدیلیاں کی گئیں اور باقی سارے ہندوستان کے لئے حاکم نے پولیس کو محکوم آبادی کو کنٹرول کرنے کا آلۂ کار بنایا۔ لیکن افسوس ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد بھی آزادی کی کوئی لہر اس قانون تک نہ پہنچ سکی۔ نفاذ شریعت ایکٹ قوم کے سامنے وقت کے اہم ترین قانونی ایجنڈے کو نمایاں کرتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ قانون کے اس نچتارے کو اسلام اور آزاد جمہوری معاشرہ سے کس طرح ہم آہنگ کیا جائے۔

خصوصی تجزیہ

نفاذِ شریعت ایکٹ پر اعتراضات کا
ایک علمی محاکمہ

قسط (۳)

پروفیسر خورشید احمد

کیا عدالتوں کو شریعت کے مطابق فیصلے کرنے کا یا پارلیمنٹ کے منظور کردہ قوانین کو شریعت کی کسوٹی پر پرکھنے کا اختیار دینے' یا عدالتوں میں علماءِ دین کو بحیثیت جج یا مشیر مقرر کرنے کا دروازہ کھولنے سے ایسی ملاکریسی قائم ہو جائے گی جو بنیادی حقوق' جمہوریت' عورتوں کی حیثیت اور دیگر امور میں ہمارے معاشرہ کو پیچھے لے جائے گی' اور تاریکی اور ظلم کی رات قوم پر مسلّط ہو جائے گی؟ کیا پارلیمنٹ جو قرآن و سنّت کے خلاف قانون نہ بنانے کی پابند ہے اور رائج قوانین کو اسلام کے مطابق بنانے کی بھی' کسی نقد و احتساب کے بغیر ان فرائض کو کسی درجہ میں بھی تشفی بخش طور پر انجام دے سکی ہے' یا مستقبل قریب میں دے سکے گی؟ دوسرے الفاظ میں کیا نفاذِ شریعت کا کام "کلیتاً" پارلیمنٹ پر چھوڑ دینا چاہیے اور وہ اس مقصد کے لئے کافی ہے' جیسا کہ شریعت بل کے بعض مخالفین کہتے ہیں؟ یہ سوالات بھی غور و فکر کے محتاج ہیں۔ اس ضمن میں ماضی کا واقعاتی جائزہ بھی مفید ہو گا۔

حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ مختلف دساتیر میں (یعنی ۱۹۵۶ء' ۱۹۶۲ء اور ۱۹۷۳ء کے دساتیر میں) قرآن و سنّت کے خلاف قانون سازی پر پابندی عائد کی گئی لیکن پارلیمنٹ کے ذریعہ قرآن و سنّت کے مطابق قانون سازی کا عمل رُونما نہ ہوا۔ پھر ۱۹۸۰ء میں فیڈرل شریعت کورٹ قائم ہوئی۔ یہ ایک مثبت اقدام تھا۔ گو اس کورٹ کی تشکیل اور اس کے اختیارات دونوں میں متعدد خامیاں اور نقائص ہیں' لیکن اس کے باوجود یہ پہلا ادارہ ہے جس نے عملاً ملکی قوانین کو اسلام کے احکام سے ہم آہنگ کرنے کا کام سنجیدگی سے شروع کیا۔ ملک کے تقریباً" ۴ ہزار قوانین میں سے

تقریباً ۱۴۰۰ کا جائزہ اس عدالت نے اپنے ان اختیارات کے تحت لیا جو دستور نے اسے استغاثہ یا اپنی صوابدید (SUO MOTTO) پر غور و جائزہ کے لیے دیے ہیں۔ عدالت نے ان میں سے ۱۵ قوانین کو مکمل طور پر قرآن و سنّت کے منافی قرار دیا ہے۔ اور ۳۰ میں جزوی ترامیم تجویز کی ہیں۔ اس کے علاوہ اسلامی نظریاتی کونسل نے بھی اپنے طور پر یہی کام کیا ہے اس نے ۱۹۸۵ء تک پارلیمنٹ کو اکتالیس (۴۱) رپورٹیں پیش کی ہیں جن میں تقریباً ۵۰۰ قوانین کا جائزہ لیا گیا ہے۔

لیکن یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ پارلیمنٹ نے ۱۹۸۵ء سے لیکر آج تک ان تمام رپورٹوں کی روشنی میں کوئی قابلِ ذکر قانون سازی نہیں کی۔ فیڈرل شریعت کورٹ کے فیصلوں کے دباؤ کے تحت صرف چند قوانین میں جزوی ترامیم منظور کی گئی ہیں اور یہاں بھی دو درجن سے زیادہ قوانین کے سلسلہ میں حکومت سپریم کورٹ میں اپیل کے لیے چلی گئی ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل کے مرتب کردہ نئے مسودہ ہائے قانون' یا مروجہ قوانین میں مجوزہ ترامیم پر اب تک غورو فکر کا آغاز بھی نہیں ہوا ہے۔ پارلیمنٹ کی اس کارکردگی کے برعکس اگر قوانین کو اسلام سے ہم آہنگ کرنے کا کوئی کام ہوا ہے تو وہ صرف فیڈرل شریعت کورٹ کے ان فیصلوں کی بناء پر ہوا ہے جو دستور کی رو سے نافذ العمل تھے۔

ہماری نگاہ میں یہ بھی ایک سانحہ سے کم نہیں ہے کہ فیڈرل شریعت کورٹ اور ملک کی اعلیٰ عدالتوں نے شریعت کی بالادستی کے قیام کے لئے جو کوششیں کی ہیں ان کا نہ عوام میں کوئی ادراک ہے اور نہ صحافت اور پارلیمنٹ میں اس کی کوئی گونج سنائی دیتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ نام نہاد ترقی یافتہ اور لبرل حضرات جن کی زبانیں انسانی حقوق کی بات کرتے نہیں تھکتیں وہ بھی خود بنیادی انسانی حقوق کے تحفظ کے سلسلہ میں ان سنہری خدمات کے بارے میں خاموش ہیں جو فیڈرل شریعت کورٹ نے احکامِ اسلام کی بنیاد پر انجام دی ہیں۔

اس عدالت کے فیصلوں کے ذریعے سرکاری ملازمین بشمول فوجی ملازمین اور غیر سرکاری اداروں کے کارکنوں کو یہ اسلامی حق ملا کہ انھیں دفاع کا موقع دیئے بغیر کسی بھی ملازمت سے فارغ نہیں کیا جا سکتا' اسی طرح ۲۵ سال کی ملازمت کے بعد جبری ریٹائر منٹ کے اختیار کو اسلامی بنیادوں پر مقید کیا گیا۔ بدنامِ زمانہ پریس اینڈ پبلی کیشنز آرڈی نینس جس کی ہر سیاسی گروہ نے مذمّت کی تھی اور برسرِ اقتدار آکر اس کی حفاظت کی تھی' اس کو ختم کرنے کا سہرا بھی فیڈرل شریعت کورٹ کے سر ہے۔ اس قانون کو فیڈرل شریعت کورٹ نے خلافِ اسلام قرار دیا۔ اور

پھر سپریم کورٹ کی شریعت بنچ کے فیصلہ کے تحت ۱۹۸۸ء میں یہ کالا قانون ختم ہوا۔ اسی طرح خود قانونِ فوجداری میں قتل کے سامراجی قانون کا خاتمہ اور اسلام کے قانونِ قصاص کا نفاذ کسی پارلیمنٹ کی سعی و جدوجہد کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ فیڈرل شریعت کورٹ اور سپریم کورٹ کی شریعت بنچ کی مساعی کے نتیجہ میں نافذ ہوا ہے۔

پاکستان کی عدالت عالیہ کی خدمات صرف فیڈرل شریعت کورٹ کے فیصلوں تک محدود نہیں۔ سپریم کورٹ نے ان ادوار میں بھی جب ملک فوجی آمریت کی گرفت میں تھا اور دستور سے محروم تھا' اپنے فیصلوں میں واضح الفاظ میں اس امر کا اعلان کیا تھا کہ قرار دادِ مقاصد دستور کی عدم موجودگی میں بھی ملک کے اعلیٰ تر قانون کی حیثیت رکھتی ہے۔ پھر جب ۱۹۸۵ء میں قراردادِ مقاصد کو دستور کا حصہ بنا دیا گیا (دفعہ ۲۔الف) تو سندھ اور پنجاب دونوں کی عدالت عالیہ کے ججوں نے اپنے کئی فیصلے قرار دادِ مقاصد کی روشنی میں مروّجہ قانون کے خلاف کیے اور قانون کے ان حصّوں کو دستور کے خلاف قرار دیا جو قرار دادِ مقاصد سے متصادم ہیں۔ اعلیٰ عدالتوں نے گزشتہ گیارہ سال میں شریعت کے عملی نفاذ کی نئی راہ کھولنے کی کوشش کی ہے اور بحیثیتِ مجموعی ان کا ریکارڈ بہت نمایاں اور روشن ہے۔

یہی وہ پس منظر ہے جس کی روشنی میں شریعت ایکٹ کے تحت عدالتوں کو اختیارات تفویض کیے جانے کی اہمیت کو سمجھا جا سکتا ہے۔ جہاں تک قانون کا تعلق ہے نفاذِ شریعت کے دو ہی راستے ہیں۔ ایک یہ کہ ملک کی پارلیمنٹ قانون سازی کرے' اور جس حد تک وہ قانون کو مدوّن (Codify) کر دے شریعت کے قوانین اس حد تک نافذ ہو جائیں۔ ۱۹۴۹ء سے ۱۹۸۰ء تک نفاذِ شریعت کا صرف یہی ایک راستہ تھا' اور اس پورے دور کا ریکارڈ بڑا ہی مایوس کن ہے۔ ۱۹۷۹ء میں صدر ضیاء الحق صاحب نے آرڈی نینس کے ذریعہ چند قوانین کو نافذ کیا۔ ان میں چار حدود آرڈی نینس' ایک آرڈی نینس جس کے ذریعہ دُرہ کی شرعی سزا کے نفاذ کا طریقہ بیان کیا گیا ہے' اور ایک آرڈی نینس زکوٰۃ اور عشر کے نفاذ کے بارے میں تھا۔ ایک دستوری ترمیم کے ذریعہ فیڈرل شریعت کورٹ کے قیام کے بعد' جس نے ۱۹۸۰ء میں کام شروع کیا' نفاذِ شریعت کے عمل میں عدالت کی شرکت نے ایک نئی اور واضح شکل اختیار کی۔ فیڈرل شریعت کورٹ کو قانون سازی کا کوئی اختیار حاصل نہیں' البتہ دستور کے تحت اسے یہ اختیار حاصل ہے کہ خود اپنی صوابدید پر' یا کسی شہری یا مرکز یا صوبائی حکومت کی درخواست پر' ملک کے رائج الوقت قوانین میں سے کسی ایسے قانون کا جو اس کے دائرۂ اختیار میں آتا ہو (دستور' مسلم پرسنل لاء' ضابطہ

فوجداری اور ضابطہ دیوانی اس عدالت کے اختیار سے مستقلاً" باہر ہیں اور مالی اور محصولاتی قوانین دس سال کے لئے اس کے دائرہ کار سے باہر تھے۔ یہ استثنیٰ دس سال پورے ہونے پر جون ۱۹۹۰ء سے ختم ہو چکا ہے) جائزہ لے سکے اور اس قانون یا قانون کے اس حصّہ کو' جو اس کی رائے میں قرآن و سنّت کے احکام سے متصادم ہے' خلافِ شریعت ہونے کی بناء پر کالعدم قرار دے سکے۔ البتہ عدالت کے لئے لازم ہے کہ متعلقہ حکومت کو اپنا مؤقف پیش کرنے کا موقع دے' اپنے فیصلے میں وہ دلائل لکھے جن کی بناء پر وہ قانون یا اس کے کسی حصّہ کو شریعت کے خلاف پاتی ہے اور قانون ساز ادارے کو مہلت دے تاکہ وہ متعلقہ قانون میں تبدیلی کر سکے۔ بصورتِ دیگر جس تاریخ کا عدالت نے تعیّن کیا ہے اس تاریخ کو وہ قانون یا قانون کا وہ حصّہ جسے عدالت نے خلافِ شریعت قرار دیا ہے کالعدم ہو جائے گا اور کتابِ قانون کا حصہ نہیں رہے گا۔

اس طرح فیڈرل شریعت کورٹ کے قیام کے بعد نفاذِ شریعت کا ایک دوسرا دروازہ کھل گیا۔ اور جس طرح امریکہ' ہندوستان' پاکستان اور دنیا کے دوسرے ان تمام ممالک میں جہاں تحریری دستور کی رو سے عدالتِ عالیہ کو یہ اختیار حاصل ہے کہ دستور سے متصادم قوانین کو کالعدم کر سکیں' اسی طرح پاکستان کی فیڈرل شریعت کورٹ اور اعلیٰ عدالتوں کو بھی یہ اختیار مل گیا کہ وہ احکامِ شریعت کی بنیاد پر ملکی قوانین کا جائزہ لیں اور جہاں انہیں شریعت سے متصادم پائیں اس حد تک ان قوانین کو کالعدم کر سکیں۔ جیسا ہم نے دیکھا ان اختیارات سے نہ صرف نفاذِ شریعت کی راہ میں پیش رفت ہوئی' بلکہ بنیادی حقوق اور آزادیوں اور جمہوریت کے ضمن میں بھی تاریخی فیصلے ہوئے۔ اور یہ ناگزیر تھا' اس لیے کہ شریعت سے بڑھ کر تو کوئی چیز بھی بنیادی حقوق اور آزادیوں اور جمہوریت کی محافظ نہیں ہو سکتی۔

اس طرح یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ شریعت ایکٹ کے تحت عدالتوں کو جو کچھ بھی اختیار دیے گئے ہیں ان سے نہ صرف پارلیمنٹ کی بالادستی مجروح نہیں ہوتی' بلکہ بنیادی حقوق اور جمہوریت کو بھی زیادہ مستحکم تحفظ حاصل ہوتا ہے۔

ہم یہاں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ اسلامی قانون کے نفاذ کے لئے بہترین طریقہ کونسا ہے ——— مدون قانون کا یا غیر مدون قانون بذریعہ عدالت کا۔ دونوں طریقوں میں جہاں کچھ مفید پہلو ہیں وہیں ان میں کچھ مشکلات بھی ہیں' ہماری نگاہ میں اب وقت نظری بحثوں کا نہیں عملی اقدام کا ہے۔ اور اس پہلو سے جہاں یہ ضروری ہے کہ اسلامی قانون کو جلد از جلد مدوّن کیا

جائے اور پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیاں اس کام کو اوّلیت دیں وہیں یہ بھی ضروری ہے کہ ملک کے تمام شہریوں کو سامراجی دور کے ان قوانین سے جلد از جلد نجات دلائی جائے جو خدا کی بغاوت پر مبنی اور سامراجی مقاصد کو پورا کرنے والے ہیں اور جس حد تک معاملات کے فیصلے شریعت کے مطابق ہو سکتے ہیں اس کا دروازہ کھولا جائے۔ جس طرح عدالتیں غلطی کر سکتی ہیں اسی طرح پارلیمنٹ بھی منزہ عن الخطاء نہیں ہے۔ عدالت کے فیصلے بھی کھلے میدان میں ہوتے ہیں۔ اگر کہیں کوئی غلطی ہو جاتی ہے تو اعلیٰ عدالتیں اس کی تصحیح کر سکتی ہیں۔ اہلِ علم بھی بحث و گفتگو کے ذریعہ شریعت کی بہتر تفہیم میں بہترین کردار ادا کر سکتے ہیں۔ شریعت کے نفاذ کے لیے ضروری ہے کہ ہر ممکن راستہ کو اختیار کیا جائے اور اس سلسلہ میں جہاں بھی موانع پائے جاتے ہیں ان کو دور کیا جائے اور پارلیمنٹ اور عدالتوں کو متحرک کر کے اس سلسلہ میں بڑی مفید خدمت انجام دی جا سکتی ہے۔

یہاں ضمناً" اس اہم بات کی طرف بھی توجہ دلانا مفید ہو گا کہ اس وقت ملک میں جو تقریباً" ۴ ہزار قوانین رائج ہیں ان میں سے ۹۵ فیصدی انگریزی دورِ اقتدار میں کتابِ قانون کا حصّہ بنے۔ آزادی کے دور میں قانون سازی کا کام بہت ہی سُست رہا ہے اور ہمارے قانون ساز ادارے آزادی کے تقاضوں کو پورا کرنے میں بری طرح ناکام رہے ہیں۔ ایک طرف ترقی پسندی اور اکیسویں صدی میں داخلہ کی باتیں ہوتی ہیں اور دوسری طرف انیسویں صدی کے سامراجی دور کے قوانین کو سینے سے لگایا ہوا ہے۔ نفاذِ شریعت ایکٹ اس سامراجی قانونی ورثہ کے لئے ایک چیلنج اور تازیانہ ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ جلد از جلد غلامی کے اس ورثہ سے نجات ملے' ایک آزاد' اسلامی اور رفاحی ریاست کے قیام کے لئے ضروری ہے کہ دورِ غلامی کے قوانین پر جلد از جلد نظرِ ثانی ہو اور اسلام کے اصولِ عدل و انصاف اور دورِ جدید کے اصلاحی اور فلاحی تجربات کو سامنے رکھ کر کتابِ قانون کو از سرِ نو مدوّن کیا جائے۔ یہی وہ چیز ہے جو قوم کو اکیسویں صدی کے خیر مقدم کے لئے تیار کر سکتی ہے۔

سامراجی دور کے قوانین اور اسلام اور آزادی کے تقاضوں میں تصادم کی صرف ایک مثال پر ہم یہاں اکتفاء کرتے ہیں۔ پولیس ایکٹ جو ۱۸۶۱ء میں نافذ ہوا اس کا مقصد اور مزاج یہ ہے کہ ایک سامراجی حکومت مقامی آبادی کو کس طرح اپنے قابو میں رکھے اور یہاں اٹھنے والی آزادی کی ہر تحریک کو کس طرح دبا سکے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ انیسویں صدی میں خود دولت برطانیہ میں پولیس کے قانون کے دو ماڈل تھے۔ ایک وہ جو انگلستان میں رائج تھا اور جس میں پولیس اور

باقی ۔۔۔ہ

"تاریخ جماعتِ اسلامی" حصہ دوم، باب اوّل

تاسیس و قیامِ جماعت

(آخری قسط)

آباد شاہ پوری

رکنیت کی حلف برداری

دستور کی منظوری کے بعد شرکائے اجتماع نے جماعت میں شرکت کا حلف اٹھایا۔ سب سے پہلے سید مودودیؒ اٹھے، کلمۂ شہادت اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ کا اعادہ کیا اور فرمایا: لوگو! گواہ رہو کہ میں آج از سرِ نو ایمان لاتا اور جماعتِ اسلامی میں شریک ہوتا ہوں ۳۷۔ سید صاحبؒ کے بعد مولانا محمد منظور نعمانی صاحب کھڑے ہوئے اور کلمۂ شہادت ادا کر کے جماعت میں شامل ہونے کا اعلان کیا۔ پھر باری باری دوسرے اصحاب کھڑے ہوتے اور کلمۂ شہادت ادا کر کے جماعت میں شریک ہوتے گئے۔ پوری مجلس پر رقّت کا عالم طاری تھا، اکثر حضرات کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ ہر شخص کلمۂ شہادت ادا کرتے ہوئے کانپ رہا تھا، شدتِ جذبات سے ہچکی بندھنے لگتی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ شہادت کی اس ذمہ داری کو وہ زمین اور آسمان کے بوجھ سے زیادہ وزنی سمجھ کر اٹھا رہا ہے ۳۸۔ بہت سے زار زار رو رہے تھے مولانا محمد منظور نعمانی کا تاثر سب سے شدید تھا وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے ۳۹۔

ادائے شہادت کا مرحلہ طے ہو چکا ۴۰، تو سید مودودیؒ نے اسلامی جماعت کی حیثیت، اس کے منشاء اور نصب العین پر پھر ایک مرتبہ روشنی ڈالی اور حاضرین کو آگاہ کیا کہ انہوں نے آج کتنا بڑا عہد کیا ہے اور اس کو کس طرح نباہنا چاہیے، پھر فرمایا کہ اب جماعتِ اسلامی کی تشکیل ہو گئی ہے، آیئے ہم سب مل کر رب العالمین سے دعا کریں کہ وہ ہماری جماعت کو استقامت اور استقلال بخشے اور ہم کو اپنی کتاب اور اپنے رسولؐ کی سنت کے مطابق چلنے کی توفیق عطا کرے۔ پھر مولانا محمد منظور نعمانی نے دعا شروع کی اور دیر تک لوگ خدا کے حضور روتے اور گڑگڑاتے

رہے ۴۱۔' اجتماعی دعا کے یہ لمحات بھی بڑے اثر انگیز اور کیف آور تھے۔ ایسے کیف آور کہ میاں طفیل محمد کے بقول "اس اجتماع میں جو لوگ شریک تھے وہ اس کی کیفیات کو عمر بھر نہ بھول سکے ہوں گے" ۴۲۔ دعا کے بعد اجتماع اگلے روز کے لئے برخاست ہو گیا ۴۳۔

انتخابِ امیر

۳ شعبان (۲۷ اگست) صبح آٹھ بجے پھر اجتماع شروع ہوا۔ اس کا اہم ترین موضوعِ کار امیرِ جماعت کا انتخاب تھا۔ اس موقع پر کہ جماعتی زندگی کا آغاز ہو رہا تھا' سید صاحبؒ نے اسلامی نقطہ' نظر سے اس زندگی کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ اس سلسلے میں آپؒ نے جو طویل تقریر کی اس کے نمایاں نکات حسب ذیل تھے:

۱۔ جماعت کے ہر فرد کو انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں سے صدقِ دل کے ساتھ نظامِ جماعت کا خیر خواہ ہونا چاہیے۔ جماعت کی بدخواہی یا افرادِ جماعت سے کینہ' بغض' حسد' بدگمانی اور ایذا رسانی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق ایمان کے منافی بدترین جرائم ہیں۔

۲۔ جماعتِ اسلامی کی حیثیت دنیوی پارٹیوں کی سی نہیں ہے جو "میری پارٹی خواہ حق پر ہو یا ناحق پر" کی بنیاد پر اپنا رویہ متعین کرتی ہیں' ہمیں اللہ پر ایمان کے رشتے نے ایک دوسرے سے جوڑا ہے۔ اس ایمان کا اوّلین تقاضا یہ ہے کہ ہماری دوستی اور دشمنی' محبت اور نفرت جو کچھ بھی ہو اللہ کے لئے ہو۔ ہم اللہ کی نافرمانی میں نہیں' فرمانبرداری میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں۔

۳۔ ایمان باللہ ہی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم جماعت کی خیر خواہی کریں۔ اس کو بیرونی حملوں اور اندرونی امراض سے بچانے کے لئے ہر وقت مستعد رہیں' اس کو راہ راست سے ہٹنے نہ دیں' اس کے اندر غلط مقاصد' غلط خیالات اور غلط طریقوں کو پھیلنے سے روکیں' اس کے اندر نہ تو نفسیاتی دھڑے بندیاں پیدا ہونے دیں اور نہ کسی کا استبداد چلنے دیں' کسی دنیوی غرض اور شخصیت کو بُت نہ بننے دیں اور اس کے دستور کو بگڑنے سے بچائیں۔

۴۔ رفقائے جماعت کا فرض ہے کہ وہ ایک دوسرے کی خیر خواہی کریں' اس خیر خواہی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ اپنی جماعت کے آدمیوں کی بے جا حمایت کریں اور ان کی غلطیوں میں ان کا ساتھ دیں بلکہ یہ ہے کہ معروف کاموں میں باہم تعاون کریں اور منکر میں نہ صرف عدم تعاون کریں بلکہ دوستانہ دردمندی اور اخلاص کے ساتھ ان کی اصلاح کی عملاً کوشش کریں'

انھیں راہ راست سے نہ بھٹکنے دیں اور کوئی ساتھی اپنے نفس پر ظلم کر رہا ہو تو اس کا ہاتھ پکڑ لیں۔

۵۔ جماعت کے اندر جماعت بنانے کی کبھی کوشش نہیں ہونی چاہیے۔ سازشیں' جتھہ بندیاں' تجوئی (Convessing)' عہدوں کی امیدواری' حمیتِ جاہلیہ اور تنابز بالالقاب اور بدظنی جماعتوں کی زندگی کے لئے مہلک بیماریاں ہیں' ان سے بچنا چاہیے۔

۶۔ جماعتی کاموں میں رفقائے جماعت سے مشورہ لینا جماعتی ذمہ داروں کا فرض ہے۔ جس سے مشورہ لیا جائے اس کا فرض ہے کہ اپنی صوابدید کے مطابق اپنی رائے صاف صاف بیان کر دے۔ ایسا نہ کرنا جماعت پر ظلم کے مترادف ہے اور کسی مصلحت کی بنا پر اپنی صوابدید کے خلاف رائے دینا جماعت کے ساتھ غداری اور مشاورت کے موقع پر اپنی رائے کو چھپانا اور جب اپنی منشاء کے خلاف کوئی بات طے ہو جائے تو جماعت میں بددلی پھیلانے کی کوشش کرنا جماعت کے ساتھ بدترین خیانت ہے۔

۷۔ جماعتی مشورے میں کسی شخص کو اپنی رائے پر اتنا اصرار نہیں کرنا چاہیے کہ یا تو اس کی بات مانی جائے ورنہ وہ جماعتی فیصلوں کو قبول کرنے سے انکار کر دے گا۔ ایسا اصرار بالآخر پورے نظامِ جماعت کو درہم برہم کر کے رکھ دیتا ہے۔

ان عمومی ہدایات کے بعد سیّد صاحبؒ نے امیر کے انتخاب میں جن امور کو ملحوظ رکھنا ضروری تھا ان کی نشاندہی کی:

۱۔ امارت کے امیدوار کسی شخص کو ہرگز منتخب نہ کیا جائے۔ اس عظیم ذمہ داری کو محض اقتدار و سیادت کا خواہاں شخص ہی اٹھانے کے لئے آگے بڑھ سکتا ہے اور ایسا شخص اللہ کی نصرت و امداد سے محروم رہتا ہے۔

۲۔ شخصی حمایت و موافقت کے جذبات کو دل سے نکال کر بے لاگ طریقے سے ایسے شخص کو منتخب کیا جائے جس کے تقویٰ' علمِ کتاب و سنت' دینی بصیرت' تدبّر' معاملہ فہمی اور راہِ خدا میں ثبات و استقامت پر آپ کو سب سے زیادہ اعتماد ہو۔

۳۔ اس طریقے سے جس شخص کو منتخب کر لیا جائے اس کی خیر خواہی' اس کے ساتھ مخلصانہ تعاون' معروف میں اس کی اطاعت اور منکر میں اس کی اصلاح کی کوشش ہر رکنِ جماعت پر فرض ہے۔

سب سے آخر میں ایک اسلامی جماعت کے امیر اور مغربی جمہوریتوں کے صدر کے درمیان

فرق کی وضاحت کی اور فرمایا کہ دیانت' تقویٰ اور خوفِ خدا کی صفات کو پیش نظر رکھتے ہوئے جس شخص کو آپ اپنا امیر منتخب کرلیں اس پر مکمل اعتماد کریں' اس پر وہ پابندیاں عائد نہ کریں جو مغربی جمہوریتوں میں صدور پر عائد کی جاتی ہیں اس لئے کہ وہاں طریقِ انتخاب ہی ایسا ہے کہ معاشرے کا سب سے عیار اور جوڑ توڑ کے فن میں ماہر شخص ہی منتخب ہوتا ہے اور جس کو منتخب کرتے وقت تمام دوسری صفات دیکھی جاتی ہیں' مگر دیانت اور خوفِ خدا کی صفات نہیں دیکھی جاتیں۔ چنانچہ اس کے شر سے محفوظ رہنے کے لئے اس پر طرح طرح کی قدغنیں لگا دی جاتی ہیں۔ جس شخص کی دیانت اور تقویٰ آپ کے نزدیک اس قدر مشتبہ ہے کہ اس پر اعتماد نہیں کر سکتے تو اس کو سرے سے منتخب ہی نہ کیجئے۴۴۔

یہ تقریر اس لحاظ سے بڑی اہم تھی کہ اس میں اسلامی ہیئت اجتماعی اور نظامِ جماعت پر پہلی بار جدید زبان میں بات کی گئی تھی۔ مسلمانوں میں اب تک جو جماعتیں کام کر رہی تھیں ان میں صدرِ جماعت اور دوسرے عہدیداروں کا انتخاب مغربی جمہوریتوں میں مروّج طور طریقوں کے مطابق کیا جاتا تھا اور جماعت کے درو بست پر قابض رہنے کے لئے ہر طرح کے جوڑ توڑ اور حربے جائز اور روا رکھے جاتے تھے' سیّد صاحبؒ نے برصغیر ہی کی نہیں غالباً" پورے عالمِ اسلام کی سیاسی تاریخ میں پہلی بار اسلامی نقطۂ نظر سے اس طریقِ انتخابِ قیادت پر تنقید کی اور ان خرابیوں کو واضح کیا جو یہ طریقِ انتخاب اپنے دامن میں رکھتا تھا اور پہلی بار ان صفات کی نشاندہی کی جو اسلام ایک اسلامی جماعت اور اس کی قیادت کے لئے ضروری گردانتا ہے۔

یہ تقریر اس اعتبار سے بھی سیّد صاحبؒ کی اہم ترین تقریر تھی کہ اس میں جو ہدایات جاری کی گئیں ان پر اس سختی سے عمل کیا گیا کہ وہ گویا جماعت کا مزاج بن گئیں۔ اس مزاج کے خلاف جب کبھی کسی فرد یا عنصر نے اس کے برعکس رویّہ اختیار کیا تو اس نے جماعت کی فضا کو اپنے خلاف پایا اور اسے بالآخر جماعت سے نکلنا پڑا۔ دوسرا اہم پہلو جس پر اس تقریر میں سیّد صاحبؒ نے زور دیا' وہ امور تھے جنھوں نے اس سے پہلے مسلمانوں کی جماعتوں میں رونما ہو کر انھیں افتراق و انتشار کی راہ پر ڈالا اور بالآخر اضمحلال سے دوچار کر دیا۔ سیّد صاحبؒ نے اپنی افتتاحی تقریر میں جماعت کو فرقہ اور گروہ میں تبدیل ہونے سے بچنے کی ہدایت کی تھی۔ اب اس تقریر میں انھوں نے ارکانِ جماعت کے سامنے وہ خطوط رکھ دیے جن پر جماعتِ اسلامی اپنے اس عظیم مقصد اور نصب العین پر قائم رہ سکتی تھی جس کے لئے وجود میں آرہی تھی۔

امیر جماعت کے انتخاب کے سلسلے میں سیّد مودودیؒ نے دو باتوں کی نشاندہی کی۔ ان میں

سے ایک وہ صفات تھیں جن کا ایک اسلامی جماعت کے امیر کے اندر پایا جانا ضروری تھا اور جنہیں ملحوظ رکھ کر امیر کا انتخاب کیا جانا تھا۔ دوسری بات امیرِ جماعت کے اختیارات اور حدودِ کار سے متعلق تھی۔ امیرِ جماعتِ اسلامی کے اختیارات اور معیادِ امارت کے ضمن میں آگے چل کے دستور میں ردو بدل کیا گیا تاہم جہاں تک پہلی بات کا تعلق تھا وہ ہمیشہ کے لئے جماعت کے دستور کا جزو لاینفک بن گئی۔ یہ وہ خصوصیت ہے جو آج تک جماعتِ اسلامی اور دوسری مسلم جماعتوں میں مابہ الامتیاز چلی آتی ہے' ملک کے اندر یقیناً" کوئی ایسی دینی و سیاسی جماعت نہیں ہے جس نے ان صفات کو اپنے صدر یا سربراہ کے لئے لازمی قرار دیا ہو اور جو اس کا انتخاب صرف انہیں صفات کو ملحوظ رکھ کر کرنے کی دستوری طور پر پابند ہو۔

سیّد صاحبؒ کی تقریر کے بعد امیرِ جماعت کے انتخاب کا مسئلہ زیرِ بحث آیا۔ شرکاء نے اس بحث میں آزادانہ حصہ لیا۔ بحث خاص کسی ایک یا دو شخصیتوں کے بارے میں نہ تھی کہ ان میں سے کون ایسا شخص ہے جو کتاب و سنّت میں دی گئی ہدایت کے مطابق (جن کی نشاندہی سیّد صاحبؒ نے اپنی تقریر میں فرمائی تھی) منصبِ امارت کے لئے موزوں ترین اور سب سے زیادہ لائقِ اعتماد ہو بلکہ یہ بحث منصبِ امارت کی نوعیت اور اس کی مدّت و معیاد کے بارے میں تھی اس بحث میں تین مختلف نقطۂ نظر ابھر کر سامنے آئے۔

ایک گروہ کی رائے تھی کہ اس وقت جماعت میں اس قدر کم آدمی ہیں کہ انتخاب کی کچھ زیادہ گنجائش نہیں' اگر اس وقت کوئی متعیّن امیر منتخب کر لیا گیا تو آئندہ جب جماعت بڑھے گی اور اہل ترین آدمی آئیں گے اس وقت وقت پیش آئے گی بلکہ نئے آنے والوں کے لئے یہ بات تامل کا باعث ہوگی کہ انہیں ایک ایسے شخص کو امیر ماننا پڑے گا جس کے انتخاب میں ان کی رائے شامل نہ تھی' اس طرح اس وقت انتخابِ امیر آگے چل کر توسیعِ جماعت کی راہ میں رکاوٹ بن جائے گا۔ اس بنا پر اس گروہ کی رائے یہ تھی کہ سردست جماعت کا امیر عارضی مدّت کے لئے منتخب کیا جائے۔

دوسرے گروہ کے شبہات بھی پہلے گروہ سے مختلف نہ تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ ابھی انبیاء کا جانشین بننے کا اہل کوئی مردِ کامل نظر نہیں آتا اس لئے اس وقت سرے سے امیر منتخب ہی نہ کیا جائے بلکہ جماعت کا انتظام اور رہنمائی ' چند آدمیوں کی ایک مجلس کے سپرد کر دی جائے اور اس مجلس کے لئے ایک صدر منتخب کر لیا جائے۔ دوسرے الفاظ میں یہ گروہ جماعت کے لئے اجتماعی قیادت (Collective Leadership) کی تجویز پیش کر رہا تھا۔

تیسرے گروہ کی رائے پہلے دونوں گروہوں سے مختلف تھی۔ اس کے خیال میں جماعت بلا امیر بے اصل بات تھی' مدتِ معینہ کے لئے انتخابِ امیر کا بھی کتاب و سنت میں کوئی نشان نہیں ملتا' پھر یہ بات بھی خلافِ حکمت و تدبر ہے کہ ہم ایک انقلابی نظریہ ... لڑنے تو دنیا بھر کی شیطانی قوتوں سے چلے ہیں' لیکن جماعت کا نظام اتنا ڈھیلا رکھیں کہ کسی بڑی جدوجہد کا تحمل نہ ہو سکے۔ امارت کے بغیر یا عارضی امارت کی بنیاد پر قائم ہونے والا نظام کبھی پختہ نہ ہو گا۔ اس لئے ضروری ہے کہ امیر کا انتخاب اسی وقت کیا جائے اور غیر معینہ مدت کے لئے کیا جائے۔

کئی گھنٹے تک بحث ہوتی رہی' مگر اتفاقِ رائے نہ ہو سکا۔ آخر ظہر کے قریب اس مسئلہ کو سات آدمیوں کی ایک کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا جنہیں ارکانِ جماعت نے متفقہ طور پر منتخب کیا تھا۔ قرار پایا کہ یہ کمیٹی جو کچھ طے کرے گی اسے سب قبول کر لیں گے۔ کمیٹی کے ارکان حسب ذیل تھے:

۱۔ مولانا محمد منظور نعمانی' مدیر الفرقان بریلی
۲۔ سید صبغت اللہ بختیاری' رائے چوٹی کڑپہ مدراس
۳۔ سید محمد جعفر پھلواروی' کپور تھلہ
۴۔ مولانا نذیر الحق میرٹھی
۵۔ مستری محمد صدیق سلطانپوری
۶۔ ڈاکٹر سید نذیر علی زیدی' الٰہ آباد
۷۔ محمد ابن علی صاحب علوی کاکوروی' لکھنؤ

اس مجلس نے بڑے غور و خوض اور بحث و تمحیص کے بعد پہلے دونوں گروہوں کی رائیں مسترد کر دیں اور تیسرے گروہ کی رائے سے اتفاق کیا کہ علمِ کتاب و سنت اور حکمتِ عملی دونوں کا تقاضا ہے کہ جماعت بلا امیر نہ رہے اور امیر کا انتخاب کسی مدت کے ساتھ مقید نہ کیا جائے۔ کمیٹی نے اس سلسلے میں اتفاقِ رائے سے جو دستوری تجویز مرتب کی اس میں ان دونوں گروہوں کے اعتراضات کو رفع کر کے مطمئن کر دیا گیا۲۵۔

چار بجے شام دوبارہ اجتماع ہوا۔ مولانا محمد منظور نعمانی نے مجلسِ منتخبہ کی جانب سے اس تجویز کو پڑھ کر سنایا اور اس کی مختصراً تشریح کی' جماعت نے اسے بالاتفاق قبول کر لیا اور طے کیا کہ یہ پوری تجویز دفعہ دہم کی حیثیت سے دستور میں بڑھا دی جائے۔

اس کے بعد مولانا محمد منظور نعمانی نے سید مودودیؒ کا نام امارت کے لئے پیش کیا اور تمام

ارکانِ جماعت نے اتفاقِ کامل سے اس کو منظور کر لیا۔ نعمانی صاحب نے سید صاحبؒ کا نام تجویز کرتے ہوئے وضاحت کی کہ دستور کے لحاظ سے امیر میں جو صفات ہونی چاہئیں خدا کے فضل سے وہ سب ان میں موجود ہیں۔ اور اس حیثیت سے جماعت کے موجودہ ارکان میں وہ فائق و ممتاز ہیں۴۶۔

انتخابِ امیر کے اس سارے عمل میں کچھ مزید روایات کی بنیاد پڑ گئی جن کو جماعت جب تک اپنائے رہے گی ان خرابیوں اور مفاسد سے بچی رہے گی جو مغربی طرز کی سیاسی پارٹیوں کا طرۂ امتیاز بن چکی ہیں:

۱۔ جماعت میں کسی بھی عہدے کے لئے از خود امیدواری کا نظام اور اس کے لئے کنویسنگ کو ہمیشہ کے لئے مسترد کر دیا گیا۔

۲۔ امیر کو منتخب کرتے وقت کسی لسانی، علاقائی عصبیت یا شخصی موافقت اور پسند کو نہیں، ان صفات کو ملحوظ رکھا گیا جو کتاب و سنت اسلامی جماعت کی قیادت کے لئے لازمی قرار دیتی ہیں۔

۳۔ مسائل پر بحث مباحثہ چاہے ارکان جماعت کی سطح پر ہو یا مقامی و مرکزی شوریٰ کی سطح پر ہمیشہ کھلی فضا میں کیا گیا۔

۴۔ معاملات و مسائل کو اتفاقِ رائے سے طے کرنے کو ہمیشہ ترجیح دی گئی۔ اتفاقِ کلی (Consensus) حاصل کرنے کے لئے کئی کئی گھنٹے بلکہ دو دو دن بحث کی جاتی۔ جماعتِ اسلامی کی طویل تاریخ میں دو تین مرتبہ سے زیادہ اس کی نوبت نہیں آئی کہ مسائل کا فیصلہ کثرتِ رائے سے کیا گیا، ورنہ تمام فیصلے اتفاقِ رائے پر مبنی ہوتے رہے ہیں۔

بیعتِ عام

اب تک اسلامی نظامِ جماعت کے لئے بیعت کا طریقہ رائج تھا، لیکن سید صاحبؒ نے رسمی طریقہ اختیار کرنے کے بجائے اجتماعی عہد کا طریقہ اختیار کیا، چنانچہ پوری جماعت نے ایک ساتھ یہ عہد کیا کہ وہ دستور کی دفعہ دہم کے مطابق امیر کی اطاعت اور اس کے حکم کی پابندی کریں گے۔ یہ گویا بیعتِ عام کی ادائیگی تھی، اور وہ بھی کسی شخصیت کے ہاتھ پر نہیں، نصب العین پر تھی۔ اس ادائیگی پر پھر وہی کیفیت طاری ہوئی جو ایک روز قبل تجدیدِ ایمان کے موقع پر طاری ہو چکی تھی۔ لوگ پھر خدا کے حضور میں گڑگڑائے اور التجا کی کہ وہ اس جماعت کو اس کے نصب العین کے مطابق چلنے کی توفیق دے۴۷۔

مروّجہ بیعت کے بجائے تجدید عہد کا طریقہ کیوں اختیار کیا؟ اس کی توضیح کرتے ہوئے اُسی

زمانے میں سیّد مودودیؒ نے ایک خط کے جواب میں لکھا:

"میں نے بہت غور و خوض کے بعد جو صورت تجویز کی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اوّلاً" ہاتھ میں ہاتھ دے کر بیعت نہ لی جائے بلکہ صرف زبانی عہد لیا جائے جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں سے لیا کرتے تھے۔ ثانیاً" کسی شخص کی طرف منسوب نہ ہو بلکہ اسلام کی طرف منسوب ہو تاکہ شخصِ خاص سے وابستگی آگے چل کر شخصیت پرستی تک نہ پہنچ سکے۔ ثالثاً" تزکیۂ نفس، اجرائے احکام اور اقامتِ نظم و انضباط وغیرہ کا کام جس شخص کے ہاتھ میں ہو وہ اس کی ذاتی حیثیت میں نہ ہو بلکہ جماعت کا سربراہ ہونے کی حیثیت میں ہو۔ جب ایک شخص سربراہ نہ رہے اور دوسرا شخص اس کی جگہ آئے تو لوگوں کی اطاعت و وابستگی بھی پہلے شخص سے ہٹ کر دوسرے شخص کی طرف منتقل ہو جائے۔ نہ یہ کہ لوگ اسی شخصِ خاص کے گرویدہ رہیں جس کے امیر ہونے پر ابتدا میں انہوں نے عہدِ اطاعت کیا تھا[۴۸]۔"

ایک اور موقع پر سیّد صاحبؒ نے فرمایا کہ انہوں نے مرّوجہ بیعت کا طریقہ اس لئے نہ اپنایا کہ دعوت نصب العین کی طرف تھی نہ کہ ان کی اپنی شخصیت یا امیرِ جماعت یا شیخ کی طرف۔

امیرِ جماعت کا پہلا پالیسی بیان

بیعتِ عام کے بعد سیّد مودودیؒ نے ایک مختصر تقریر کی۔ یہ تقریر بنیادی طور پر تین نکات پر مشتمل تھی۔ پہلا نکتہ خود ان کی اپنی ذات کے بارے میں تھا اور دوسرے دو نکات کو وہ پالیسی بیان (Policy Statement) سمجھنا چاہیے جو انہوں نے امیرِ جماعت منتخب ہونے کے بعد ان منصبی فرائض کے سلسلے میں دیا جن پر وہ خود اور اپنے رفقاء کو کاربند دیکھنا چاہتے تھے۔ پہلے نکتہ کے بارے میں انہوں نے جو کچھ فرمایا وہ محض رسمی الفاظ نہ تھے بلکہ اس عاجزی اور فروتنی کا اظہار تھا جو ان کی شخصیت اور کردار میں رچی بسی ہوئی تھی اور اللہ کے بندے عاجز و منکسر ہوا کرتے ہیں، متکبّر و مترفّع نہیں۔ وہ جب بارِ فرائض اٹھاتے ہیں تو عجز و انکسار کے ساتھ ڈرتے اور لرزتے ہوئے اٹھاتے ہیں، انہیں اپنے علم اور صلاحیتوں پر غرّہ نہیں ہوتا بلکہ اللہ کا عاجز و ناقص بندہ ہونے کی حیثیت سے وہ اس کی مدد کے طالب ہوتے ہیں اور جن لوگوں کی قیادت کی ذمّہ داری ان کے کندھوں پر ڈال دی جاتی ہے ان کا قدم قدم پر تعاون چاہتے ہیں۔ فرمایا:

"میں آپ کے درمیان نہ سب سے زیادہ علم رکھنے والا تھا نہ سب سے زیادہ متقی، نہ کسی اور خصوصیت میں مجھے فضیلت حاصل تھی ——— مجھے اس تحریک کی عظمت اور خود اپنے نقائص کا پورا احساس ہے، میں جانتا ہوں کہ یہ وہ تحریک ہے جس

کی قیادت اولو العزم پیغمبروںؑ نے کی ہے اور زمانۂ نبوت گزر جانے کے بعد وہ غیر معمولی انسان اس کو لے کر اٹھتے رہے ہیں جو نسلِ انسانی کے گُلِ سرسَبد تھے۔ ایک لمحے کے لئے اپنے بارے میں یہ غلط فہمی نہیں ہوئی کہ میں اس عظیم الشان تحریک کی قیادت کا اہل ہوں' بلکہ میں تو اس کو ایک بدقسمتی سمجھتا ہوں کہ اس وقت اس کارِ عظیم کے لئے آپ کو مجھ سے بہتر کوئی آدمی نہ ملا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اپنے فرائضِ امارت کی انجام دہی کے ساتھ برابر تلاش میں رہوں گا کہ کوئی اہل تر آدمی اس کا بار اٹھانے کے لئے مل جائے اور جب میں ایسے آدمی کو پاؤں گا تو سب سے پہلے اس کے ہاتھ پر بیعت کروں گا' نیز میں ہمیشہ ہر اجتماعِ عام کے موقع پر جماعت سے بھی درخواست کرتا رہوں گا کہ اب اس نے کوئی مجھ سے بہتر آدمی پا لیا ہے تو وہ اسے اپنا امیر منتخب کرلے' میں اس منصب سے بخوشی دستبردار ہو جاؤں گا۔ میں اپنی ذات کو کبھی خدا کے راستے میں سدِّ راہ بننے نہ دوں گا اور کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ دوں گا کہ ایک ناقص آدمی اس جماعت کی رہنمائی کر رہا ہے' اس لئے ہم اس میں داخل نہیں ہو سکتے۴۹۔"

پالیسی بیان کے سلسلے میں سید صاحبؒ نے فرمایا:

(۱) میں حدِّ وسع تک انتہائی کوشش کروں گا کہ اس کام کو پوری خدا ترسی اور احساسِ ذمّہ داری کے ساتھ چلاؤں اور قصداً اپنے فرض کی انجام دہی میں کوئی کوتاہی نہ کروں۔ میں اپنے علم کی حد تک کتاب اللہ اور سنّت رسول اللہ اور خلفائے راشدین کے نقشِ قدم کی پیروی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھوں گا۔

(۲) مجھ سے کوئی لغزش ہو یا آپ میں سے کوئی محسوس کرے کہ میں راہِ راست سے ہٹ گیا ہوں' تو مجھ پر بدگمانی نہ کرے کہ میں عملاً ایسا کر رہا ہوں' بلکہ حسنِ ظن سے کام لے اور نصیحت سے مجھ سیدھا کرنے کی کوشش کرے۔

(۳) آپ کا مجھ پر یہ حق ہے کہ میں اپنے آرام و آسائش اور اپنے ذاتی فائدوں پر جماعت کے مفاد اور اس کے کام کی ذمّہ داریوں کو ترجیح دوں' جماعت کے نظم کی حفاظت کروں' ارکانِ جماعت کے درمیان عدل اور دیانت کے ساتھ حکم کروں' جماعت کی طرف سے جو امانتیں میرے سپرد ہوں ان کی حفاظت کروں' اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے دل و دماغ اور جسم کی تمام طاقتوں کو اس مقصد کی خدمت میں صرف کر دوں جس کے لئے آپ کی جماعت اٹھی ہے۔

(۴) میرا آپ پر یہ حق ہے کہ جب تک میں راہ راست پر چلوں آپ اس میں میرا ساتھ دیں۔ میرے حکم کی اطاعت کریں۔ مشوروں سے اور امکانی امداد و اعانت سے میری تائید کریں اور جماعت کے نظم کو بگاڑنے والے طریقوں سے پرہیز کریں ۵۰۔

اس پالیسی بیان کا اہم ترین حصّہ وہ ہے جس میں سیّد صاحبؒ نے جماعتِ اسلامی کو فقہی مکتبِ فکر میں تبدیل ہو جانے سے روکنے کی ہدایت فرمائی۔ ماضی میں بھی ائمہ عظام کا طرزِ عمل یہ رہا ہے کہ وہ اپنی فقہی آرا کو امت کے لئے لازمی نہ گردانتے تھے۔ امام مالکؒ نے تو اپنی کتاب موطا کو عباسی سلطنت کا قانون بنانے کی اجازت دینے سے معذرت کر دی تھی' دراصل وہ جانتے تھے کہ کسی بھی صاحبِ علم کی فقہی آرا سے منسلک ہو جانے کے نتائج جمود' اندھی تقلید' فرقہ بندی اور فقہی مجادلے کی صورت میں نکلتے ہیں جو بالآخر امت سے تحرک اور جدّوجہد کی زندگی چھین لیتے ہیں' اصول ترک ہو جاتے ہیں اور فروعات اصول کی جگہ لے لیتے ہیں' ان کے اہلِ علم کا کام اپنے امام اور فقیہہ کے کلام و اقوال کو بطورِ حُجت پیش کرنے اور اس کے آگے سرِ تسلیم خم کروانے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہتا اور ان کے عوام انہی فقہی آراء کو اوّل و آخر اسلام سمجھ بیٹھتے ہیں' کتاب و سنّت کے احکام و تعلیمات ثانوی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں اور فقہی آرا اتنی اہمیت کا مقام حاصل کر لیتی ہیں کہ ایک فقہی مسلک کے حامل لوگ دوسرے مکتبِ فقہ سے تعلق رکھنے والوں کو کافر قرار دینے لگتے ہیں' امّت اپنے مقصدِ وجود کو تج کے ٹکڑیوں میں بٹ جاتی ہے اور سر پھٹول میں مصروف ہو جاتی ہے۔ سیّد صاحبؒ جن کا تاریخی شعور بڑا توانا تھا' ان کی اس پوری صورت حال پر نظر تھی' چنانچہ انہوں نے اعلان فرمایا:

"فقہ و کلام کے مسائل میں میرا ایک خاص مسلک ہے جس کو میں نے ذاتی تحقیق کی بنا پر اختیار کیا ہے —— اب میری حیثیت اس جماعت کے امیر کی ہو گئی ہے۔ فقہ و کلام کے مسائل میں میں جو کچھ آئندہ لکھوں گا یا کہوں گا اس کی حیثیت امیرِ جماعتِ اسلامی کے فیصلہ کی نہ ہو گی بلکہ میری ذاتی رائے ہو گی۔ ارکانِ جماعت کو میں خداوندِ برتر کا واسطہ دے کر ہدایت کرتا ہوں کہ کوئی شخص فقہی و کلامی مسائل میں میرے اقوال کو دوسروں کے سامنے حجت کے طور پیش نہ کرے۔ اسی طرح میرے ذاتی عمل کو بھی جسے میں نے اپنی تحقیق کی بنا پر جائز سمجھ کر اختیار کیا ہے' نہ دوسرے لوگ حجت بنائیں اور نہ بلا تحقیق محض میرا عمل ہونے کی حیثیت سے اس کا اتباع کریں۔ ان معاملات میں ہر شخص کے لئے آزادی ہے۔ جو لوگ علم رکھتے ہوں'

وہ اپنی تحقیق پر اور جو علم نہ رکھتے ہوں وہ جس کے علم پر اعتماد رکھتے ہوں اس کی تحقیق پر عمل کریں۔ نیز ان معاملات میں اختلافِ رائے رکھنے اور اپنی رائے کا اظہار کرنے میں بھی سب آزاد ہیں۔ ہم سب جزئیات و فروع میں اختلافِ رائے رکھتے ہوئے ایک دوسرے کے بالمقابل بحث و استدلال کرتے ہوئے بھی ایک جماعت بن کر رہ سکتے ہیں جس طرح صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین رہتے تھے۔۵۱۔"

جماعت کی پہلی مجلسِ شوریٰ

امیر کے انتخاب سے جماعت مکمل طور پر وجود میں آگئی۔

اسی شام امیرِ جماعت نے اصحابِ شوریٰ کا انتخاب کر لیا اور اس طرح نظمِ جماعت اپنی بالکل سادہ شکل میں مکمل ہو گیا۔ اگلی صبح ۴ شعبان (۲۸ / اگست ۱۹۴۱ء) آٹھ بجے صبح مجلسِ شوریٰ کا پہلا اجلاس ہوا جس میں تحریک کے مستقبل اور جماعت کے لائحہ عمل پر سوچ بچار کیا گیا اور خاصے غور و خوض اور بحث و گفتگو کے بعد جماعت کے کام کو پانچ شعبوں میں تقسیم کر دیا گیا:

۱۔ شعبہ علمی و تعلیمی۔
۲۔ شعبہ نشرو اشاعت۔
۳۔ شعبہ تنظیمِ جماعت۔
۴۔ شعبہ مالیات۔
۵۔ شعبہ دعوت و تبلیغ۔

اجتماع کا اختتام

اسی روز پھر اجتماع عام منعقد ہوا جس میں امیرِ جماعت نے ارکانِ جماعت کو اس لائحہ عمل کی تفصیلات سے آگاہ کیا اور پھر کام کرنے کے لئے ہدایات دیں۔ ان ہدایات کے بعد امیرِ جماعت اور شوریٰ کے ارکان نے ارکانِ جماعت کو علیحدہ علیحدہ بلا کر ہر ایک کے احوال اور صلاحیتوں سے آگاہی حاصل کی اور ان حالات اور صلاحیتوں کے لحاظ سے انہیں کام سپرد کیا۔ جہاں مقامی جماعتیں بن چکی تھیں وہاں ان کے لئے امراء کا تقرر کیا۔ ۵ شعبان کو جو کام باقی رہ گیا تھا اسے انجام دیا۔ اور اجتماع ختم ہو گیا ۵۲۔

ایک تاریخ ساز واقعہ

جماعتِ اسلامی کا قیام اس وقت کی ہنگامہ خیز دنیا میں محض ایک معمولی واقعہ تھا' اس کا

تاسیسی اجتماع کسی پروپیگنڈے کے زور شور کے بغیر شروع ہوا اور خاموشی سے ختم ہو گیا۔ ایک نہایت محدود سے حلقے کے سوا اس کو کسی نے اہمیت نہ دی۔ برصغیر میں مسلمانوں کے اندر جماعت سازی روز مرہ کا شیوہ بن چکا تھا۔ آئے دن جماعتیں وجود میں آتیں اور چند روزہ بہارِ زندگی دکھا کر ختم ہو جاتیں۔ لیڈری ایک پیشہ بن چکی تھی۔ کسی میں صلاحیت ہوتی' یا نہ ہوتی من کی موج طالع آزماؤں کو میدان میں لے آتی اور مسلمانوں کی قیادت کے لئے مسابقت شروع ہو جاتی جس میں حریف کو شکست دینے کے لئے غیر اخلاقی ہتھکنڈے اختیار کرنے سے بھی گریز نہ کیا جاتا۔ ایسے عالم میں ایک نئی جماعت کا قیام' ایک عام آدمی کے لئے کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا' تاہم اس واقعہ کا اس وقت جو ردّ عمل بھی تھا' یہ ایک تاریخ ساز واقعہ تھا۔ ایک ایسی جماعت وجود میں آ گئی تھی جو آنے والے برسوں میں نہ صرف برصغیر' بلکہ جنوبی ایشیا اور عالمِ اسلام تک میں اہم کردار ادا کرنے والی تھی۔ مشہور مغربی مصنف ولفریڈ کینٹویل سمتھ (W.C.SMITH) نے جماعتِ اسلامی کے قیام کو ہم عصر اسلامی دنیا کے اہم ترین واقعات میں سے ایک واقعہ قرار دیا جو ہم عصر پاکستان کی اہم ترین ہم عصر قوتوں میں ایک قوت بن گئی ۵۳۔ آگے چل کر دوسرے مغربی مصنفین نے بھی جماعتِ اسلامی کے نظریات' اس کی دعوت اور قوت کے بارے میں بہت کچھ لکھا' لیکن جس معاصر دنیا میں جماعت کی تاسیس و تشکیل ہوئی اس کے لئے اس میں کوئی چونکا دینے والی بات نہ تھی۔ البتہ یہ اپنی بہت سی خصوصیات کی وجہ سے اس دور کی تمام سیاسی و دینی جماعتوں میں منفرد نوعیت رکھتی تھی۔ یہ پہلی اسلامی نظریاتی جماعت تھی جو کتاب و سنّت کی بنیادوں پر وجود میں آئی تھی' جس کا مقصد مسلمانوں کے سیاسی و اقتصادی مفادات کا تحفظ یا ملک پر سے غیر ملکی تسلط کا خاتمہ نہ تھا بلکہ جو اسلام کی سربلندی اور اسلامی نظامِ حیات کا قیام چاہتی تھی' جس کے ارکان اور متفقین کسی شخصیت کے گرد نہیں' اسلامی نظریہ کے گرد جمع ہوئے تھے۔

برصغیر میں اب تک جتنی مسلم جماعتیں سرگرمِ عمل رہی تھیں وہ تین قسم کی تھیں۔ ایک وہ جو نام تو اسلام کا لیتی تھیں مگر قومی اور سیکولر نصب العین کی علمبردار تھیں دوسری وہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے اسلام کا حلیہ بگاڑنا چاہتی تھیں مگر اپنا نصب العین اسلام اور مسلمانوں کا غلبہ بتاتی تھیں اور تیسری وہ جو بظاہر دینی تھیں مگر مغرب کے دیے ہوئے تصورِ قومیت پر مبنی لادینی سیاست کی حامل تھیں اور جن کی قیادت علماء کے ہاتھوں میں تھی اور اس ناتے سے دینی اور اسلامی باتیں بھی ہو جاتی تھیں۔ ان تینوں قسم کی جماعتوں میں ایک بات

مشترک تھی۔ ان میں سے ہر ایک کا تنظیمی ڈھانچہ سیکولر تھا۔ ان کے برعکس جماعتِ اسلامی پہلی جماعت تھی جس کا مقصد اور نصب العین بھی خالصتہً اسلامی تھا اور تنظیمی ہیئت بھی کتاب و سنت کی دی ہوئی تعلیمات کی روشنی میں قائم کی گئی تھی جس کے اندر داخل ہونے کے لئے اسلام کے احکام کا عملاً پابند ہونا ضروری تھا۔ پھر یہ پہلی جماعت تھی جس نے اسلامی طریقِ انتخاب کو اپنایا' جس میں امیدواری (Candidature) کو مسترد اور کسی شخص کے حق میں کنویسنگ یا اس کے خلاف پروپیگنڈے کو غیر اخلاقی اور مذموم قرار دے دیا گیا۔ جس کے امیر کو جماعت کی جنرل باڈی (General Body) یعنی ارکان منتخب کرتے اور وہی اس کو معزول کرنے کا اختیار رکھتے۔ جماعت کا دستور اور نظم ارتقاء کے مختلف ادوار سے گزرا' تنظیم کا ڈھانچہ حالات کے مطابق وسعت اختیار کرتا رہا اور فرائض و اختیارات کی تقسیم کی نئی نئی جہتیں پیدا ہوئیں' امیرِ جماعت کے عزل کا اختیار ارکان کی منتخب کردہ مجلسِ شوریٰ کو دیدیا گیا تاہم اس کا انتخاب بھی ارکان براہ راست خفیہ ووٹوں سے کرتے ہیں اور وہ اپنے کاموں کا ارکان ہی کو جوابدہ ہوتی ہے۔ اس طرح جماعتِ اسلامی ساری دنیا میں واحد سیاسی جماعت ہے جس میں آخری اتھارٹی جماعت کی جنرل باڈی کے ہاتھ میں ہے اور اس اختیار کو نہ تو کوئی دباؤ ڈال کر سلب کر سکتا ہے اور نہ اس پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔

جماعتِ اسلامی کی تشکیل کے موضوع پر ایک مرتبہ سید مودودیؒ نے بڑی مفصل گفتگو کی تھی' اور ان امور کا ذکر فرمایا تھا جو انہوں نے اسلامی نظام کے قیام کو جماعتِ اسلامی کا نصب العین قرار دیتے ہوئے پیش نظر رکھے تھے' انہی امور نے دوسری جماعتوں کے مقابلے میں جماعتِ اسلامی کو وہ خصوصیات دیدی تھیں جن میں وہ آج تک ممتاز اور منفرد چلی آتی ہے۔ سید صاحبؒ نے فرمایا تھا:

> "جو چیز میں نے جماعت کی تشکیل میں پیشِ نظر رکھی وہ یہ تھی کہ جماعت ایسے افراد پر مشتمل ہونی چاہیے جو نہ صرف عقیدے میں مخلص ہوں بلکہ اپنی انفرادی سیرت و کردار میں بھی قابلِ اعتماد ہوں ــــــ مسلمانوں کی جماعتوں اور تحریکوں کو جس چیز نے آخر کار خراب کیا وہ اچھے لوگوں کے ساتھ بہت سے ناقابلِ اعتماد لوگوں کا شریک ہو جانا تھا ــــــ انہی مشاہدات کی بنا پر میں نے یہ رائے قائم کی کہ اصل اہمیت کثرتِ تعداد کی نہیں بلکہ قابلِ اعتماد سیرت و کردار رکھنے والے کارکنوں کی ہے۔ خواہ تھوڑے ہی افراد ملیں مگر بہر حال ہماری جماعت صرف ایسے لوگوں پر مشتمل ہونی

چاہیے جن میں سے ایک ایک فرد کی سیرت قابلِ اعتماد ہو۔ جس کے قول اور عمل پر لوگ بھروسہ کر سکیں ـــــ مسلمانوں کی تحریکوں کے ناکام ہونے یا ابتدا میں کامیاب ہو کر آخر کار ناکام ہو جانے کے اہم اسباب میں سے ایک سبب تنظیم کی کمی بھی ہے۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ جماعتِ اسلامی کا نظم نہایت سخت اور مضبوط ہونا چاہیے' اس میں ذرّہ برابر بھی ڈھیل گوارا نہیں کرنی چاہیے۔ ایک غیر منظم جماعت کبھی ایسی طاقتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی جو تنظیم کے ساتھ اٹھنے والی ہوں ـــــ

"ایک اور چیز جس کو ہم نے جماعت کی تشکیل میں پیش نظر رکھا' یہ تھی کہ جدید اور قدیم تعلیم یافتہ دونوں قسم کے عناصر کو ملا کر ایک تنظیم میں شامل کیا جائے اور یہ دونوں مل کر اسلامی نظام قائم کرنے کی ایک تحریک چلائیں ـــــ (اس طرح) جماعتِ اسلامی نے جدید اور قدیم تعلیم یافتہ لوگوں کو ملا کر ایک مزاج اور ایک طرزِ فکر رکھنے والی مشترک قیادت فراہم کی ہے۔ ورنہ اس سے پہلے علماء جب کبھی جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے ساتھ ملے ہیں محض ایک مددگار قوت کی حیثیت سے ملے ہیں' قیادت میں ان کا کوئی حصہ نہیں رہا ہے ـــــ ان کا کام صرف یہ تھا کہ جس قیادت کی بھی وہ تائید کریں اس کے پیچھے مسلمانوں کو لگا دینے کی خدمت انجام دیں"۔

"جماعت نے یہ کوشش بھی کی کہ ہر فرقہ اور مسلک کے مسلمانوں کو ایک جگہ جمع کیا جائے ـــــ جماعتِ اسلامی بنی ہی اس اصول پر ہے کہ آپ اپنا جو مسلک بھی رکھتے ہوں اس پر عمل کیجئے مگر دوسرے پر زبردستی اس کو نہ ٹھونسیے۔ جس عمل کو آپ صحیح نہیں سمجھتے وہ نہ کیجئے۔ لیکن اس بات کا مطالبہ بھی نہ کیجئے کہ دوسرا بھی اسے صحیح نہ سمجھے اور اسے چھوڑ دے۔ اس کے بعد ہم سب مل کر اسلامی نظام قائم کرنے کی کوشش کریں ـــــ

جماعتِ اسلامی کے نظام کو خرابیوں سے پاک رکھنے کے لئے ہم نے جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ ارکان کے اجتماعات میں کھلا کھلا محاسبہ ہوتا ہے' صاف صاف تنقید ہوتی ہے۔ جس شخص میں کوئی کمزوری ہو یا جس سے کوئی غلطی سرزد ہوئی ہو بے تکلف اس پر گرفت کی جاتی ہے اور اس کی اصلاح کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ـــــ"۔

یہ تھی وہ جماعت جو ۳ شعبان ۱۳۶۰ھ ۲۶ اگست ۱۹۴۱ء کو وجود میں آئی اور جو اپنی انہی خصوصیات کی بنا پر ولفریڈ کنٹویل سمتھ (Wifred Cantwell Smith) کے بقول پاکستان کی اہم ترین قوتوں میں سے ایک قوت بن گئی۔

حواشی و تعلیقات

۳۷۔ روداد جماعتِ اسلامی' حصہ اوّل' ص ۹

۳۸۔ روایت میاں طفیل محمد۔ تذکرۂ سیّد مودودیؒ ص ۲۳

۳۹۔ فیروز پور کے مولوی محمد علی صاحب مرحوم جو جماعتِ اسلامی کے تاسیسی اجتماع میں شریک تھے ان کا بیان تھا کہ مولانا محمد منظور نعمانی سب سے زیادہ رونے والے تھے۔ (تذکرہ سیّد مودودیؒ ص ۳۳۲)

۴۰۔ پانچ چھ اصحاب تجدیدِ شہادت کر کے جماعت میں شریک ہو چکے تھے کہ ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کا ذکر کیے بغیر جماعتِ اسلامی کی تاریخ لکھنے والا کوئی مورخ آگے نہیں بڑھ سکتا۔ چھٹے یا ساتویں نمبر پر میاں طفیل محمد اٹھے۔ کوٹ اور پتلون میں ملبوس' ٹائی باندھے ہوئے' ہاتھ میں ہیٹ لیے' داڑھی مونچھ صاف' ۲۷ برس کے نوجوان' ریاست کپور تھلہ کے رہنے والے' کپور تھلہ میں وکالت کر رہے تھے' سیّد صاحبؒ کی دعوت سے متاثر ہوئے تو بقول خود انہوں نے تہیہ کر لیا کہ "دنیا میں کوئی دوسرا شخص اس (سیّد مودودیؒ) کا ساتھ دینے کے لئے اٹھے یا نہ اٹھے میں بہر حال اس کا ساتھ دوں گا اور آخر دم تک ساتھ دوں گا" (تذکرۂ سیّد مودودیؒ ص ۲۳) ڈھائی مہینے پہلے ان کی شادی ہوئی تھی اور سسرال جا رہے تھے کہ راستے میں پتہ چلا کہ جماعت کا تاسیسی اجلاس ہو رہا ہے چنانچہ سسرال کے بجائے لاہور اجتماع میں پہنچ گئے تھے (قومی ڈائجسٹ لاہور جنوری ۱۹۸۰ء ص ۱۷۳) میاں صاحب نے اٹھ کر جب اپنے آپ کو جماعت کی رکنیت کے لئے پیش کیا تو مولانا محمد منظور نعمانی نے مخالفت کی۔ میاں صاحب کے الفاظ میں انہوں نے کہا "اس کرنٹے کو ہم کیسے لے سکتے ہیں؟ اس کی شکل و صورت' اس کا حلیہ' اس کا پیشہ کوئی چیز بھی تو اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ اس کو جماعت میں لیا جائے۔ بعض دوسرے حضرات نے بھی ان کی تائید کی۔ میرے اوپر اس کا سخت رد عمل ہوا اور فی الواقع میں رونے لگا۔ میں نے کہا کہ جب میں اپنے آپ کو اس مقصد کے لئے پیش کر رہا ہوں تو آخر آپ کیوں نہیں جماعت میں مجھے شامل ہونے کا موقع دیتے۔ داڑھی کوئی ایک دن میں تو نہیں اگ سکتی اور کپڑے اتار کر یہاں ننگا تو نہیں ہو سکتا۔ آپ مجھے موقع تو دیجئے۔ مولانا مودودیؒ صاحب کی تجویز پر مجھے امتحاناً" اس شرط کے ساتھ جماعت میں شامل کر لیا گیا کہ اگر چھ ماہ کے اندر میں نے اپنے ذریعۂ معاش اور دوسری قابلِ اصلاح چیزوں کو درست کر لیا تو رکنیت برقرار رہے گی ورنہ ساقط کر دی جائے گی" (تحریکِ اسلامی مرتب خورشید احمد ادارہ چراغِ راہ' کراچی نومبر ۱۹۶۳ء' نیز تذکرۂ مودودیؒ ص ۲۳' ۲۴) یہ واقعہ اگرچہ میاں صاحب کی ذات سے تعلق رکھتا ہے' لیکن جماعت کی تاریخ کے نقطہ نظر سے اس کی اہمیت یہ ہے کہ اس سے دو کردار ابھر کر سامنے آتے ہیں' ایک کردار میاں صاحب کا ہے کہ وہ جس مصمم ارادے کے ساتھ جماعت میں شریک ہوئے'

اس پر آج پچاس سال بعد ان سطور کے قلمبند ہونے تک قائم ہیں' یہی نہیں وہ راہِ حق میں اس طرح گامزن ہوئے کہ آگے ہی آگے بڑھتے چلے گئے حتیٰ کہ آخر کار سیّد صاحبؒ کے جانشین منتخب کیے گئے۔ دوسرا کردار مولانا محمد منظور نعمانی کا ہے جنہوں نے میاں صاحب کی غیر متشرع وضع قطع اور لباس وغیرہ پر اعتراض کر کے جماعت میں شرکت کی مخالفت کی' وہ بمشکل چند قدم ہی اس راہ پر چل سکے جسے ان کے علم و فضل نے خود راہِ حق تسلیم کیا تھا اور اسے حق تسلیم کر کے ہی جماعت میں شریک ہوئے تھے' یہی نہیں کہ وہ صرف چند قدم چل سکے بلکہ وہ اپنے طرزِ عمل سے جماعت اسلامی کو ایک شدید بحران سے دوچار کرنے کا ذریعہ بنے اور اس کی سعی کی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ دوسرے صاحب جنہوں نے میاں صاحب کو جماعت میں شامل کرنے کی مخالفت اور مولانا محمد منظور نعمانی کی تائید کی تھی' مولانا جعفر شاہ پھلواروی تھے (تحریکِ اسلامی مرتبہ خورشید احمد ص ۲۵۱) جو اس بحران میں نعمانی صاحب کے ساتھ جماعت سے نکل گئے۔ نوٹ : مولانا محمد جعفر شاہ صاحب نے میرے داخلے کی مخالفت نہیں کی بعض دوسرے حضرات تھے جن کو میں نہیں جانتا (طفیل محمد)

۴۱۔ روداد جماعتِ اسلامی حصّہ اوّل ص ۱۰

۴۲۔ تذکرۂ سیّد مودودیؒ ص ۲۳

۴۳۔ روداد جماعتِ اسلامی حصّہ اوّل ص ۱۰

۴۴۔ روداد جماعتِ اسلامی حصّہ اوّل ص ۱۰۔۱۳

۴۵۔ روداد جماعتِ اسلامی حصّہ اوّل ص ۱۳۔۱۶

۴۶۔ تاریخ جماعتِ اسلامی (قلمی مسوّدہ) از سیّد نقی علی ص ۳۰۰

۴۷۔ روداد جماعتِ اسلامی حصّہ اوّل ص ۱۶

۴۸۔ مکاتیب سیّد ابو الاعلیٰ مودودیؒ' اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ' لاہور' نومبر ۱۹۷۲ء' ص ۲۷

۴۹۔ روداد جماعتِ اسلامی حصّہ اوّل ص ۱۷۔۱۸

۵۰۔ روداد جماعت اسلامی حصّہ اوّل ص ۱۸

۵۱۔ ایضاً ص ۱۸۔۱۹

۵۲۔ ایضاً

۵۳۔ Islam in Modern History (The New American Library Hentfor Book New York 1957) P.235.

امام ربیعؒ بن صبیح بصریؒ

جناب عبدالرشید عراقی

سرزمینِ ہند میں جن اکابرینِ اسلام نے علم و عمل کی قندیلیں روشن کیں ۔ ان میں زمرۂ تبع تابعین میں دو ممتاز شخصیتوں کے نام ملتے ہیں۔ ان میں سے ایک اسرائیل بن موسیٰ بصری ہیں اور دوسرے ربیع بن صبیح بصریؒ ہیں۔

ربیع بن صبیح بصریؒ کا وطن بصرہ تھا۔ اور قبیلہ بنو سعد بن زید کے آزاد کردہ غلام تھے۔۱ ربیع بن صبیحؒ نے جب ہوش سنبھالا تو اس وقت بصرہ اسلامی علوم و فنون کا مرکز تھا۔ اور امام حسن بصریؒ (م ۱۱۰ھ) نے علم کی شمع روشن کی ہوئی تھی۔ امام حسن بصریؒ نہ صرف علم و فضل میں یکتائے روزگار تھے۔ بلکہ شجاعت و شہامت میں بھی یگانۂ زمن تھے۔ امام ربیع بن صبیح بصریؒ نے امام حسن بصریؒ سے جملہ علومِ اسلامیہ میں استفادہ کیا۔ امام حسن بصریؒ کے علاوہ دوسرے علمائے اسلام سے بھی امام ربیع بن صبیحؒ نے اکتسابِ فیض کیا۔۲

آپ کے تلامذہ میں ایسے ائمہ کرام کے نام ملتے ہیں جو اپنے علم و فضل ' عدالت و ثقاہت اور حفظ و ضبط میں یکتائے روزگار تھے۔ مثلاً امام عبداللہ بن مبارکؒ (م ۱۸۱ھ) امام ابوداؤد طیالسیؒ (م ۲۰۴ھ) امام سفیان ثوریؒ (م ۱۶۱ھ)' امام وکیع بن الجراحؒ (م ۱۹۶ھ)۔۳

تمام اربابِ سیر اور تذکرہ نگاروں نے امام ربیع بن صبیحؒ کے علم و فضل اور اوصاف و کمالات کا اعتراف کیا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ (م ۸۵۲ھ) لکھتے ہیں:

کان عابدا ومجاھدا ۴۔ وہ عابد اور مجاہد تھے۔

ان کی ثقاہت و عدالت پر بھی علمائے کرام کا اتفاق ہے۔

امام احمد بن حنبلؒ (م ۲۴۱ھ) کے صاحبزادے عبداللہ بن احمد بیان کرتے ہیں ۔ کہ میں نے اپنے والد امام احمد حنبلؒ سے ربیع بن صبیحؒ کے بارے میں دریافت کیا تو آپؒ نے فرمایا:

لا باس به رجل صالح ۔۵ "ان سے روایت کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں' نیک آدمی ہیں"۔
امام ربیع بن صبیحؒ کی زندگی کے آخری سال مجاہدانہ سرگرمیوں میں بسر ہوئے جس کی بنا پر محدثین کرامؒ نے اصول روایت و درایت اور جرح و تعدیل کی رو سے ان میں کچھ کمی محسوس کی ۔ اور ان میں کچھ جرح بھی کی ہے۔

امام محمد بن ادریس شافعیؒ (م ۲۰۴ھ) فرماتے ہیں:

> ربیعؒ بہت بڑے غازی تھے اور جب وہ متنِ حدیث سے غیر متعلق شخص کی تعریف کرتے تو اسے ختم ہی کر دیتے تھے۔۶

امام احمد بن حبانؒ (م ۳۵۴ھ) نے ان کے بارے میں جو ریمارکس دیئے ہیں ۔ ان کو حافظ ابنِ حجرؒ (م ۸۵۲ھ) نے تہذیب التہذیب میں بایں الفاظ نقل کیا ہے:

> بلاشبہ حدیث ان کا فن نہ تھا۔ انھیں روایت حدیث میں وہم بہت زیادہ ہوتا تھا۔ حتیٰ کہ غیر شعوری طور پر ان کی حدیث منکر ہوجاتی تھی۔ ان کے منفرد ہونے کی حالت میں ان کی روایت کو دلیل بنانا پسند نہیں کرتا۔ ۷۔

تاہم امام ابن حبان (م ۳۵۴ھ) نے ان کے زہدو ورع اور تضرع و الحاح کا اعتراف کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

> ربیعؒ بصرہ میں سب سے زیادہ عبادت گذار اور صاحبِ ورع تھے کثرت تہجد کی بنا پر ان کا گھر شب میں شہد کی مکھی کا چھتہ بن جاتا تھا۔ ۸۔

امام ربیع بن صبیحؒ جہاں علم و فضل میں منفرد حیثیت کے مالک تھے۔ شجاعت و بہادری میں بھی ضرب المثل تھے۔ ان کی علمی سرگرمیوں کا مرکز بصرہ کے قریب ایک قصبہ آباوان تھا۔ علامہ بلاذریؒ (م ۲۷۹ھ) لکھتے ہیں کہ:

> ربیع بن صبیح بصریؒ نے بصرہ کے عوام سے چندہ وصول کر کے آباوان کی قلعہ بندی کی ۔ اور اس کی مرابطت کی خدمت انجام دی ۔

اسلامی علوم و فنون کو جن ائمہ کرام نے سینوں سے سینوں میں منتقل کیا۔ ان میں امام ربیع بن صبیحؒ کو شرفِ اوّلیت حاصل ہے۔ اور ان کو اسلام میں سب سے پہلے مصنف کے لقب سے یاد کیا گیا ہے۔ صاحبِ کشف الظنون حاجی خلیفہ مصطفیٰ بن عبداللہؒ (م ۱۰۶۷ھ) لکھتے ہیں:

> قیل ھو اول من صنف و بوب فی الاسلام ۔۹ کہا گیا کہ یہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اسلام میں تصنیف کی اور ابواب قائم کیے۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ (م ۱۳۷۳ھ) لکھتے ہیں:

ربیع بن صبیحؒ ان بزرگوں میں تھے، جنہوں نے احادیث کے منتشر اوراق کے یکجا کرنے میں سب سے پہلے حصہ لیا تھا۔۱۰

۱۵۹ھ میں خلیفہ مہدی کے حکم سے جو فوج ہندوستان کی طرف روانہ ہوئی، اس میں ربیع بن صبیح بصریؒ بھی شامل تھے۔ اسلامی فوج نے بھاڑ بھروت (گجرات کاٹھیاواڑ) کا محاصرہ کیا۔ اور آخر شدید جنگ کے بعد اسلامی فوج نے فتح حاصل کی۔

ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی رفیق دارالمبلغین اعظم گڑھ لکھتے ہیں:

اس جنگ میں ربیع بن صبیحؒ نے اپنے زیر قیادت رضاکاروں میں جہاد کا جوش اور ولولہ پیدا کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اسی جوش اور جذبۂ شہادت کا نتیجہ تھا کہ مجاہدین کے سیلِ رواں اور ان کے پرجوش حملوں کے سامنے آنے والی طاقت چور چور ہوگئی۔۱۱

بھاڑ بھروت کی فتح کے بعد ربیع بن صبیحؒ نے ۱۶۰ھ میں وفات پائی۔ علامہ ابن سعدؒ (م ۲۳۰ھ) لکھتے ہیں:

خرج غازیا الی الھند فمات فدفن فی جزیرۃ من الجزائر بسنتہ ۱۶۰ھ فی اول خلافتہ من اہل البصر کان معہ۱۲۔

وہ ہندوستانی غازی کی حیثیت سے آئے۔ اور وہیں انتقال فرما کر ۱۶۰ھ میں کسی جزیرہ میں مدفون ہوئے۔ وہ مہدی کی ابتدائی خلافت کا زمانہ تھا۔ یہ تفصیل مجھے بصرہ کے ایک شخص نے بتلائی جو جنگ میں ان کے ساتھ شریک تھا۔

علامہ ابن العماد الحنبلی (م ۱۰۸۹ھ) لکھتے ہیں:

و توفی و غمازۃ فی الرجعتہ بالبحر الربیع بن الصبیح البصری۔۱۳۔

جنگ میں بحری راستے سے واپسی کے وقت ربیع بن صبیح بصریؒ کا انتقال ہوا۔

۱۰۔ ابن حجر (م ۸۵۲ھ) تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۲۴۷

۱۱۔ کتاب الجرح و التعدیل ج ۱ ص ۴۶۴

۱۲۔ کتاب الجرح و التعدیل ج ۱ ص ۴۶۴

۱۳۔ تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۲۴۸

باقی ص ۵۵ پر

رسائل و مسائل

اسلام میں عورت کی امامت جائز ہے؟

سوال : روز نامہ پاکستان لاہور کی اشاعت ۴ نومبر ۹۱ء میں "ڈاکٹر جاوید اقبال اور ناصرہ جاوید" —— "علم دوستی اور روشن خیالی کا مظہر گھرانہ" کے عنوان سے ایک انٹرویو چھپا ہے۔ انٹرویو لینے والی بھی ایک خاتون صحافی ہے۔ موصوفہ رقمطراز ہیں: "ڈاکٹر جاوید اقبال کی خوبصورت لائبریری میں جب میں نے فقہ' قانون' تاریخ اور علوم و فنون کی کتابوں کا ذخیرہ دیکھا تو میں پوچھنے پر مجبور ہو گئی کہ ان کتابوں کے مطالعہ سے اور فقہی مسائل پر غور کے بعد آپ کے نزدیک اسلام نے عورت کو کیا مقام دیا ہے؟ اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب نے تاریخ اور حدیث میں سے دو واقعات سنائے۔ "ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خاتون کو امامت کیلئے مقرر کیا اور وہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے تک امامت کرتی رہیں۔ اسی طرح امام شافعیؒ کو شریعت اور سنت کی تعلیم ایک خاتون نے دی اور جب وہ فوت ہوئے تو اس خاتون نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی"۔

جواب طلب بات یہ ہے کہ کیا اسلام میں عورت کی امامت جائز ہے؟

جواب : جو لوگ بغیر علم کے امام بن جاتے ہیں یا امام بن جانے کی کوشش کرتے ہیں وہ اسی طرح کی امامت کرتے ہیں جس طرح کی امامت کے بے سند واقعات ڈاکٹر جاوید اقبال نے بیان کیے ہیں۔ محض اس بنیاد پر کہ مستند ہے ان کا فرمایا ہوا۔ تاریخ و سیرت کا ذخیرہ خواتین کی امامت کے تذکرہ سے خالی ہے۔ اگر خواتین کی امامت جائز ہوتی تو جلیل القدر خواتین حضرت فاطمۃ الزہراؓ' ازواجِ مطہرات اور دیگر خواتینِ اسلام کے تذکرے اس سے خالی نہ ہوتے۔ آپ خود سوچیں کہ اگر امامت میں خواتین کا حصہ ہوتا تو اس کا استحقاق معروف اور مشہور خواتین کا ہوتا یا ایک غیر معروف خاتون کو یہ درجہ حاصل ہوتا۔

امامت تو دور کی بات ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تو صریح حدیث ہے کہ عورت کی نماز اپنے گھر میں مسجد کی نماز سے بہتر ہے۔ اور گھر میں بھی سامان کے حفاظتی کمرہ میں نماز، گھر کے دوسرے کمروں (جن میں آمدورفت ہوتی ہے) سے بہتر ہے (ترمذی شریف)۔ نیز عورتوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ مسجدوں میں نماز پڑھنے کے لئے اپنے شوہروں سے اجازت لے کر جائیں۔ اس لئے شوہروں کو آپؐ نے تلقین فرمائی کہ "اگر عورتیں نماز پڑھنے کے لئے مسجدوں میں جانا چاہیں تو انہیں منع نہ کرو۔" نیز فرمایا "عورتوں کی نماز عورتوں کی آخری صف میں بہتر ہے۔ بہ نسبت عورتوں کی پہلی صف کے" (کیونکہ عورتوں کی پہلی صف مردوں کی آخری صف سے قریب ہو گی اور ان کی آخری صف مردوں سے دور ہو گی)۔ امتِ مسلمہ کا ہمیشہ سے تعامل چلا آرہا ہے کہ کسی بھی دور میں عورتیں امام نہیں بنیں۔ حیرت ہے کہ جو لوگ تحقیق کے مبادی سے بھی واقف نہیں ہیں وہ محقق بن جاتے ہیں۔ ڈاکٹر جاوید اقبال اگر اسلام کے حوالے سے بات کرنا چاہتے ہیں تو انہیں قرآن و حدیث اور امتِ مسلمہ کی تاریخ سے اس کا ثبوت پیش کرنا چاہیے۔ انہیں اگر اس پورے ذخیرہ سے بزعمِ خویش کوئی ثبوت ملا ہے تو وہ دو خواتین کے واقعات ہیں جو بذاتِ خود اس بات کی دلیل ہیں کہ عورتوں کے لئے یہ مقام و مرتبہ نہیں ہے ورنہ تاریخ اس قسم کے واقعات سے بھری ہوئی ہوتی۔ ان کے بیان کے مطابق اگر ان کی بات مان لی جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ صرف دو خواتین کو پوری اسلامی تاریخ میں ان کا حقیقی مقام ملا۔ "نعوذ باللہ" گویا خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلافتِ راشدہ کے دور سے آج تک پوری اسلامی تاریخ میں عورتوں کو ان کے حق سے محروم رکھا گیا ہے۔ اور اب اس دور میں بزعمِ خویش ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب عورتوں کو ان کے حقوق دیکر انصاف قائم کرنا چاہتے ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ خاتون خواتین کی امام بن سکتی ہے۔ اس طرح سے کہ مرد امام کی طرح صف سے آگے ہو کر تنہا نہ کھڑی ہو بلکہ صف میں کھڑی ہو۔ اور یہ بھی صرف جواز کے درجہ میں ہے اگر کسی خاتون یا خواتین کو اس کا شوق ہو تو وہ امامت کر سکتی ہیں لیکن یہ بھی معمول نہیں بن سکتا۔ ام ورقہؓ شہیدہ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی اجازت دی تھی اور وہ اپنے گھر کی خواتین کو امامت کراتی تھیں۔

"قدروی عن ام ورقة ان النبی صلی اللہ علیه وسلم اذن لها ان یوذن لها ویقام وتوم نساء اهل دارها۔ (المغنی لا بن قدامة)

(بے شک نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ام ورقہ کو اجازت دی تھی کہ ان کے لئے اذان دی جائے

اور اقامت کہی جائے اور وہ اپنے گھر کی خواتین کی امامت کیا کریں۔)

یہ بات قطعاً" غلط ہے کہ امام شافعیؒ کا جنازہ کسی خاتون نے پڑھایا تھا۔ اس موضوع پر مزید تفصیل اور تحقیق کی ضرورت ہو تو آپ اس موضوع پر تحریر کردہ کتب کا مطالعہ کریں۔ ان کتب میں سے ایک عمدہ کتاب "عورت کی سربراہی" مصنفہ مولانا گوہر رحمان اور دوسری مولانا فضل الرحمان بن محمد کی تصنیف کردہ ہے جسے انجمنِ اہلحدیث، مسجد مبارک، اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور نے شائع کیا ہے۔

جہاد میں رقم لگانے سے فریضۂ حج ساقط نہیں ہوتا

سوال: ۱۔ بندہ ایک ریٹائرڈ ملازم ہے، عمر ۶۰ سال سے کچھ اوپر ہے۔

۲۔ بندہ کی بیٹی جس کی عمر تقریباً" ۲۲ سال ہے، کی شادی تا حال نہیں ہو سکی۔ البتہ منگنی ہو گئی ہے۔

۳۔ بندہ کی ریٹائرمنٹ طبی بنیادوں پر ۱۹۸۶ء کے دوران ہوئی۔ ذیابیطس کا پرانا مریض ہے Depression کا بھی شکار چلا آتا ہے۔ بندہ اس وقت بوجہ عمومی کمزوری لاٹھی کے سہارے تھوڑا بہت چل لیتا ہے۔

دیرینہ خواہش تھی کہ حج کی سعادت سے بہرہ مند ہو جاتا مگر نمبر ۲ پر دی گئی ذمہ داری کے باعث یہ معاملہ ملتوی ہوتا رہا۔ بندہ کی موجودہ صحت کی وجہ سے عزیز و اقارب جو کہ حجِ بیت اللہ کی سعادت سے مستفید ہو چکے ہیں، کا کہنا ہے کہ بندہ کے لئے یہ فریضہ ادا کرنا مشکل ہے۔

اندریں حالات بندہ نے فیصلہ / ارادہ کیا ہے کہ اگر صحت حج کی ادائیگی کے معاملے میں واقعی مانع ہے تو بندہ حج البدل کا اہتمام کیوں نہ کرے۔ ساتھ ساتھ یہ بھی خیال آرہا ہے کہ اگر اسلام میں گنجائش ہو تو حج / حج البدل پر اٹھنے والی رقم کو جہاد افغانستان / جہاد کشمیر / جماعت اسلامی یا کسی یتیم و بے سہارہ بچی کی شادی کے سلسلہ میں دیدیا جائے تو کیا اس صورت میں حج / حج البدل ادا ہو جائے گا۔

جواب: حجِ بدل وہ آدمی کرا سکتا ہے جو خود حج کرنے کے قابل نہ ہو۔ اگر ایک آدمی چل پھر سکتا ہے، ایک شہر سے دوسرے شہر سفر کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ حج بھی کر سکتا ہے۔ کیونکہ آج کے دور میں حج کے لئے کافی سہولتیں حاصل ہیں۔ بعض لوگ خود طواف نہیں کر سکتے

تو انہیں چارپائی پر بٹھا کر طواف کرا دیا جاتا ہے۔ صفا و مروہ کے درمیان سعی بھی اسی طرح کرا دی جاتی ہے۔ کنکر پھینکنے کا کام کسی وکیل سے لیا جا سکتا ہے۔ اس کی روشنی میں آپ خود فیصلہ کر لیں کہ آپ سفر اور حج کے قابل ہیں یا کہ نہیں۔ اگر استطاعت پاتے ہیں تو آپ خود حج کریں ورنہ کسی اور کو اپنی طرف سے حج کے لئے بھیج دیں۔ وہ آپ کی طرف سے حج کی نیت کریگا اور اخراجات آپ کو ادا کرنے ہوں گے۔

حج آپ پر فرض ہے اور جہاد آپ کے لئے نفل ہے۔ اس لئے جہاد فنڈ میں رقم ادا کر دینے سے آپ پر عائد فرض ساقط نہیں ہو گا۔ البتہ جہاد فنڈ میں رقم لگانے کا ثواب مل جائیگا۔ حج پھر بھی آپ کو کرنا پڑے گا یا کسی کو حج پر اپنے بدل میں بھیجنا ہو گا۔

کسی کی زمین کو برائے نام قیمت پر جبراً" خریدنا" غصب ہے

سوال: میری اراضی پانچ کنال تیرہ مرلے کاروباری علاقہ میں واقع ہے' جس کی قیمت موجودہ حالات کے مطابق چار لاکھ روپے فی کنال کے حساب سے ۲۲ لاکھ ساٹھ ہزار روپے بنتی ہے۔ میونسپل کمیٹی اسے بطور قبرستان استعمال کرنا چاہتی ہے۔ انگریز کے زمانہ کے قانون کا سہارا لیتے ہوئے نہایت ہی قلیل قیمت پر قبضہ کرنا چاہتی ہے۔ کیا میونسپل کمیٹی کا یہ اقدام شرعاً" درست ہے؟

جواب: وفاقی' صوبائی یا مقامی حکومت کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی شخص کی چیز کو برائے نام قیمت پر جبراً" خرید لے۔ میونسپلٹی اگر کسی شخص کی زمین رفاہی مقصد کے لئے لینا چاہتی ہے تو مارکیٹ ریٹ پر خریدے۔ قبرستان کے لئے جگہ فراہم کرنا میونسپل کمیٹی کا فرض ہے۔ اس کے اخراجات اسے برداشت کرنا چاہئیں نہ کہ ایک شخص پر اس کا بوجھ ڈال دیا جائے۔ کسی ایک شخص کی زمین مارکیٹ ریٹ سے کم قیمت پر خریدنے کا مطلب یہ ہوا کہ قبرستان فراہم کرنا اس شخص کی ذمہ داری ہے' جو واضح طور پر غیر معقول بات ہے۔ انگریز نے اگر کوئی قانون بنایا تھا تو وہ صرف اسی حد تک قابل عمل ہو گا جو شریعت اور عقل کے مطابق ہے' بصورت دیگر یہ غصب شمار ہو گا اور غصب کی اجازت کسی کو بھی نہیں دی گئی۔ ہدایہ میں ہے: **الغصب فی الشریعۃ اخذ مال متقوم محترم بغیر اذن المالک علی وجہ یزیل یدہ**" جلد ۳ ص ۳۰۷۔ شریعت میں غصب کا معنی دوسرے کے قیمتی مال کو اس کے مالک کی اجازت کے بغیر اس طرح سے لے لینا

کہ مالک کا قبضہ ختم ہو جائے۔ پس یہ مذکورہ مسئولہ صورت غصب کا حکم رکھتی ہے' جو حرام ہے۔ واللہ اعلم

طویل عرصہ کی زکوٰۃ متعین کرنے کا طریقہ

سوال : ۱۹۴۰ء میں ایک صاحب نے ۵۰ تولہ سونا خرید کر محفوظ کر لیا۔ جب کہ اُس وقت اس کی قیمت ۲۰ روپیہ فی تولہ تھی' ۱۹۹۱ء میں اس سونے کی زکوۃ ادا کرنے کا مسئلہ پیدا ہوا ہے جب کہ سونا اِس وقت قریباً" ۳۵۰۰ روپے فی تولہ ہے۔ اب ۱۹۴۰ء سے لیکر ۱۹۹۱ء تک ۵۰ سال کی مدت کے لئے مذکورہ سونے کی قیمت کا اوسط نکالنے کا کیا طریقہ ہے؟ نیز طویل عرصہ کی زکوۃ کے تعین کا طریقہ بھی وضاحت کے ساتھ بتایئے۔

جواب : زکوۃ ادا کرتے وقت گزشتہ سالوں کی قیمت نہیں لگائی جائیگی تا کہ اوسط نکالنے کی ضرورت پڑے بلکہ جب آپ زکوۃ ادا کر رہے ہیں اس وقت کی قیمت لگائی جائیگی مثلاً آپ نے ۱۹۴۰ء میں ۵۰ تولے سونا ذخیرہ کیا اور اب تک اس کی زکوۃ نہیں ادا کی اور اب ادا کرنا چاہتے ہیں تو موجودہ ریٹ ۳۵۰۰ روپے فی تولہ کے حساب سے ۵۰ تولے سونا پر جو زکوۃ آتی ہے یعنی ۴۰ فیصد وہ آپ ادا کر دیجئے۔ ۵۰ تولے سونے کا وہ حصہ جو زکوۃ میں نکل جائے اس کے علاوہ باقی آپ کی ملکیت ہے۔ زکوۃ دینا پڑے گی یہاں تک کہ ساڑھے سات تولے سونا سے کم ہو جائے تو پھر زکوۃ نہیں۔ اگر روپیہ اور نوٹ کی شکل میں زکوۃ دیں گے تو ہر سال پچاس تولے سونا کی زکوۃ دینا ہو گی۔

اسلام اور وکالت

سوال : مقدمات دیوانی ہوں یا فوجداری' فریقینِ مقدمہ' اجرت پر وکیل مقرر کرتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ایک فریق برسرِ حق اور دوسرا برسرِ باطل ہوتا ہے۔ اور یہ کہ ہر فریق یا موکل اپنے اپنے وکیل کو حقیقتِ حال سے آگاہ کر دیتا ہے۔

ازاں بعد وکیل صاحب اپنی مہارتِ فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے برسرِ باطل موکل کو برسرِ حق ثابت کرنیکی کوشش کر کے اس کو جرم یا جرائم کی سزا سے بچانا چاہتے ہیں۔ اور ان کے طریقِ کار سے آپ پوری طرح واقف ہیں۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا کتاب و سنت کی رُو

سے ایسی وکالت اور اس پر اجرت لینا حلال ہے؟

اور کیا یہ **تعاون علی الاثم والعدوان** کی تعریف میں نہیں آتا۔ اور کیا جماعتِ اسلامی کے وکلاء حضرات اس قسم کے تعاون کے مرتکب نہیں ہوتے؟ اور کیا اس سلسلہ میں جماعتِ اسلامی نے اپنے وکلاء پر کوئی پابندیاں عائد کر رکھی ہیں اور ان پر عمل ہو رہا ہے؟

جواب: جو کام انسان خود نہیں کر سکتا وہ کام اس کا وکیل بھی نہیں کر سکتا۔ اگر ایک انسان خود عدالت میں جھوٹ بولے تو وہ آخرت میں اپنے جرم کی سزا کے علاوہ جھوٹ بولنے کی سزا بھی پائے گا۔ اگر وہ اپنے مقدمہ میں کسی کو وکیل کرتا ہے اور اس کا وکیل جھوٹ بولتا ہے اور اسے سزا سے بچانے کی کوشش کرتا ہے تو وہ مجرم ہے۔ اور جماعتِ اسلامی اپنے متفقین' کارکنان اور ارکان بلکہ تمام مسلمانوں کو تلقین کرتی ہے کہ وہ سچ بولیں' اسلام کو اپنے اوپر اور دنیا کے دوسرے لوگوں پر نافذ کریں۔ ایک مومن کی زندگی کا اصل مشن اقامتِ دین ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسی مقصد کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔ بلکہ تمام انبیاء کی بعثت کا مقصد یہی تھا۔ وکالت کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ ایک انسان جو سچی بات خود اچھے انداز میں بیان نہیں کر سکتا دوسرا اسے اچھے انداز میں بیان کر دے۔ نیز جو جرم اس سے سرزد ہوا ہے اس کی قانونی سزا کیا ہے' اس قانون کی نشاندہی میں عدالت کی رہنمائی کرے۔ اس لئے ایک وکیل کے لئے ضروری ہے کہ وہ سچ بولے اور دوسرا یہ بھی ضروری ہے کہ وہ عدالت کے سامنے مجرم کی یا اپنے موکل کی شرعی سزا یا شرعی حکم کی نشاندہی کرے۔ انگریزی قانون میں سے صرف ایسے قانون کا حوالہ دے جو شرعی حکم سے نہ ٹکراتا ہو اور اگر شرعی حکم سے ٹکراتا ہو تو عدالت کے سامنے شرعی قانون بیان کرے اور عدالت سے شرعی قانون نافذ کرنے کا مطالبہ کرے۔ جو وکیل اس سلسلہ میں وقت اور محنت صرف کرے اس پر اجرت لینے کا مستحق ہے۔ اگر ہمارے ملک کے وکلاء اس طریقہ پر عمل شروع کر دیں تو آج ہی عدالتوں میں اسلام نافذ ہو سکتا ہے اور وہ عدالتوں کو شرعی قوانین کے نفاذ پر مجبور کر سکتے ہیں۔ وکلاء کی اسلامی تنظیمیں اس طرز کی وکالت کا آغاز کرنے کا اہتمام کر سکتی ہیں اور وکلاء کو اس کی دعوت و ترغیب بھی دے سکتی ہیں۔ اللہ کرے کہ یہ سلسلہ شروع ہو تاکہ ہم زندگی کے اس شعبہ میں اللہ رب العالمین کی بندگی کا حق ادا کر سکیں۔

تیسرے گروہ کی رائے پہلے دونوں گروہوں سے مختلف تھی۔ اس کے خیال میں جماعت بلا امیر بے اصل بات تھی، مدتِ معینہ کے لئے انتخابِ امیر کا بھی کتاب و سنت میں کوئی نشان نہیں ملتا، پھر یہ بات بھی خلافِ حکمت و تدبر ہے کہ ہم ایک انقلابی نظریہ ــــ . لڑنے تو دنیا بھر کی شیطانی قوتوں سے چلے ہیں، لیکن جماعت کا نظام اتنا ڈھیلا رکھیں کہ کسی بڑی جدوجہد کا تحمل نہ ہو سکے۔ امارت کے بغیر یا عارضی امارت کی بنیاد پر قائم ہونے والا نظام کبھی پختہ نہ ہو گا۔ اس لئے ضروری ہے کہ امیر کا انتخاب اسی وقت کیا جائے اور غیر معینہ مدت کے لئے کیا جائے۔

کئی گھنٹے تک بحث ہوتی رہی، مگر اتفاقِ رائے نہ ہو سکا۔ آخر ظہر کے قریب اس مسئلہ کو سات آدمیوں کی ایک کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا جنہیں ارکانِ جماعت نے متفقہ طور پر منتخب کیا تھا۔ قرار پایا کہ یہ کمیٹی جو کچھ طے کرے گی اسے سب قبول کر لیں گے۔ کمیٹی کے ارکان حسب ذیل تھے:

۱۔ مولانا محمد منظور نعمانی، مدیر الفرقان بریلی
۲۔ سید صبغت اللہ بختیاری، رائے چوٹی کڑپہ مدراس
۳۔ سید محمد جعفر پھلواروی، کپور تھلہ
۴۔ مولانا نذیر الحق میرٹھی
۵۔ مستری محمد صدیق سلطانپوری
۶۔ ڈاکٹر سید نذیر علی زیدی، الہ آباد
۷۔ محمد ابن علی صاحب علوی کاکوروی، لکھنؤ

اس مجلس نے بڑے غور و خوض اور بحث و تمحیص کے بعد پہلے دونوں گروہوں کی رائیں مسترد کر دیں اور تیسرے گروہ کی رائے سے اتفاق کیا کہ علمِ کتاب و سنت اور حکمتِ عملی دونوں کا تقاضا ہے کہ جماعت بلا امیر نہ رہے اور امیر کا انتخاب کسی مدت کے ساتھ مقید نہ کیا جائے۔ کمیٹی نے اس سلسلے میں اتفاقِ رائے سے جو دستوری تجویز مرتب کی اس میں ان دونوں گروہوں کے اعتراضات کو رفع کر کے مطمئن کر دیا گیا۵۴۔

چار بجے شام دوبارہ اجتماع ہوا۔ مولانا محمد منظور نعمانی نے مجلسِ منتخبہ کی جانب سے اس تجویز کو پڑھ کر سنایا اور اس کی مختصراً تشریح کی، جماعت نے اسے بالاتفاق قبول کر لیا اور طے کیا کہ یہ پوری تجویز دفعہ دہم کی حیثیت سے دستور میں بڑھا دی جائے۔

اس کے بعد مولانا محمد منظور نعمانی نے سید مودودیؒ کا نام امارت کے لئے پیش کیا اور تمام

حقیقت میں ایسی ہی ہوتی۔ یہی ہے کمالِ ادب کہ حقیقت کا من مانا عکس نظر آئے بلکہ برعکس بھی!

مجھے کرنل محمد خاں کے ان الفاظ کے بعد مزید کسی نقد و نظر کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ کرنل صاحب کہتے ہیں کہ "یہ کوئے ملامت نہیں' کوئے ظرافت ہے جو شہرِ شرافت سے گزرتے ہوئے خانۂ لطافت تک جا پہنچتا ہے۔"

میں نے نجمی صاحب کو بے تکلفانہ خط میں لکھا کہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اپنی ہستی میں سے ایک اور سلمیٰ یاسمین نجمی برآمد کرلی ہے اور اسے ساری داستان کا کردار بنا دیا ہے' اس کردار کو آپ کہیں ہونق دکھاتی ہیں اور کہیں پیکرِ حکمت ------ اور وہ طرح طرح کے نکتے پیدا کر کے اپنے ارد گرد کی کمزوریوں کو ایسے طریقے سے نمایاں کرتی ہیں کہ ہنساتی بھی جاتی ہیں۔ یوں دوسروں کو خوشی کے چند لمحات دینے کے لئے اپنے آپ کو قربانی کا بکرا بنانا بڑی مشکل گھاٹی ہے۔ ویسے یہ ساری بات میں نے اس طرح نہیں لکھی تھی بس زیبِ داستاں کے لئے کچھ اضافہ کردیا ہے جو خط میں محذوف چھوڑ دیا تھا۔

المختصر کوئے ملامت طنز و مزاح کی صنف میں بالکل ایک نئے انداز کی کتاب ہے اور یہ تخریب کاروں' قاتلوں' ڈاکوؤں اور خیانت کاروں کے دکھی معاشرے میں کتنے ہی ہونٹوں کو تبسم کے پھولوں سے سجا دے گی۔

وفاقی شرعی عدالت کا تاریخ ساز فیصلہ مرتب : جناب ڈاکٹر سیّد اسعد گیلانی۔ اہتمامِ اشاعت: جمیعت اتحاد العلماء پاکستان' ملتان روڈ' لاہور۔ سفید کاغذ' رنگین سادہ سرورق۔ ۴۸ صفحات۔ قیمت درج نہیں۔

پچھلے دنوں وفاقی شرعی عدالت' پاکستان کے سامنے ۵۶ ممتاز علماء کی طرف سے سود کے حرام ہونے کے بارے میں درخواست پیش کی گئی کہ عدالت فیصلہ دے کہ دستور' حکومت کے نظم اور بنکوں میں سود کا جو لین دین جاری ہے یہ خلافِ اسلام ہے۔ چنانچہ چیف جسٹس جناب ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن' جناب جسٹس ڈاکٹر علامہ فدا محمد خان اور جناب جسٹس عبیداللہ خاں پر مشتمل فل بنچ نے ۱۴ نومبر کو بلا خوفِ لومتہ لائم سود اور سود در سود اور بنکوں کے سود اور تمام اشکالِ سود کے ناجائز' خلافِ اسلام اور اس لئے خلافِ دستور ہونے کا فیصلہ سنا دیا جو جنگ مورخہ ۱۵ نومبر (لاہور ایڈیشن) میں اس طرح شائع ہوا:

—— سود سے متعلق ۲۲ قوانین کالعدم قرار دے دیے گئے۔

—— وفاقی شرعی عدالت نے قرآن و سنت کے منافی آئینی دفعات کو ۳۰ جون ۱۹۹۲ء تک اسلامی احکامات کے مطابق بنانے کی ہدایت کر دی۔ دوسری صورت میں تمام شقیں اگلے دن غیر مؤثر ہو جائیں گی۔

—— بنک کا سود ربٰو کے دائرے میں آتا ہے' اور ربٰو اپنی تمام صورتوں میں حرام ہے' مسئلہ لمبے عرصے سے حل طلب تھا' اس لئے سفارشات کا انتظار مناسب تصوّر نہیں کیا گیا۔

(وفاقی شرعی عدالت)

۱۱۹ شریعت درخواستوں اور ۳ شُود پرومو ٹو نوٹسوں کو نمٹانے والے اس عدالتی فیصلے کی کچھ تفاصیل اس پمفلٹ میں ملیں گی۔

محترم جج صاحبان کے لئے خدا کے ہاں جو اجر اس فیصلے کا ہے' وہ اپنی جگہ' میری دانست میں وہ درخواست دہندگان' وکلا' علما' کلرک اور چپراسی تک جو سُود کی حرمت کا قانونی فیصلہ چاہتے تھے اور اس سلسلے میں عدالتی سرگرمیوں میں حصّہ دار تھے وہ بھی خدا کی رحمت سے اپنا اپنا حصّہ پائیں گے۔

مرقعِ جامعہ اردو: مرتّب' مرزا خلیل بیگ ودیگر اصحاب۔ ناشر جامعہ اردو' علی گڑھ۔ ملنے کا پتہ: سرسید بک ڈپو' جامعہ اردو' علی گڑھ۔ قیمت کا کوئی ذکر نہیں۔

جامعہ اردو کا قیام ۱۹۳۹ء میں عمل میں آیا' ۱۹۸۹ء میں اس کا پچاس سالہ جشنِ زریں منانے کا فیصلہ کیا گیا اور ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ اس جشنِ زریں کو جامۂ عمل پہناتے ہوئے جو تقریبات منائی گئیں اور جن شخصیتوں نے جامعہ کے اندر سے سرگرمیوں میں حصہ لیا اور جنھوں نے باہر سے آکر رونق افزائی کی (ان میں وزرا وعمائد شامل ہیں) ان سب کا تذکرہ اس باتصویر مرقع میں موجود ہے۔ تقاریر میں بعض اچھی اچھی باتیں ہیں۔ مثلاً وشواناتھ پرتاپ سنگھ سابق وزیراعظم کی خوبصورت تقریر میں سے چند مختصر اقتباس:

(۱) "میں پوچھتا ہوں کہ ہندی اور اردو ٹکراؤ کی بات کہی گئی۔ میں اس سبھا میں کہتا ہوں کہ میں زندہ ہوں۔ یہ میں نے ہندی بولی یا اردو؟"

(۲) "اگر ملک محبت ہے تو صدیوں کے بعد یہ وراثت ہم کو ملی ہے۔ اس محبت کو توڑ کر کیا گھر بنا رہے ہیں؟ ہم نے گھر کے سب سامان یکجا کر لئے

ہیں مگر ہم ایک کنبہ نہیں بنا سکتے۔"

(۳) "مندر اور مسجد کو تو چونے اور گارے سے جوڑا جا سکتا ہے' لیکن اگر دل ٹوٹ گئے تو میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ کونسے چونے اور گارے سے ہم اس کو جوڑیں گے۔"

لالہ زارِ نعت: از لالہ صحرائی' ناشر: مکتبہ' اہل قلم' پوسٹ بکس نمبر ۴۷۵ ملتان۔ ملنے کے تین پتوں میں سے ایک: المنار بک ڈپو' منصورہ' ملتان روڈ لاہور۔ صفحات ۲۴۸' سفید کاغذ' مجلد' قیمت ۱۵۰ روپے۔

ہمارے دوست لالہ صحرائی کبھی کبھی نثر لکھتے تھے تو اسے شعر میں سوچتے تھے' مگر شاعری کی وادی میں مدتوں پہلے دو چار قدم چل کر کنارہ کش ہو گئے۔ بقول مشفق خواجہ یہ تو "ایک ادبی معجزہ" ہو گیا کہ لالہ صحرائی کے صحرائے تخلیق میں یکایک شعر--- اور مسلسل شعر--- نعت کے پیرائے میں کسی ظاہری کدو کاوش کے بغیر اگنے لگے۔

میں نے ان اشعار یا نعتوں کو پڑھتے ہوئے یوں محسوس کیا کہ یہ دل کی باتیں ہیں جو جذبوں کے پُل سے گذر کر وادیٔ شعر میں پہنچیں اور نطق نے پھولوں اور موتیوں جیسے الفاظ طشتوں میں رکھ کر پیش کیے' مگر وہ اپنے سادہ سے الفاظ اپنے ساتھ لائیں۔ میں نے بھی ایک مرتبہ کچھ اشعار کو عنوان دیا تھا' "نغماتِ دل"۔ سو اس وقت ہم لالہ صحرائی کے نغمات سے حظ اندوز ہو رہے ہیں۔ ایک ایک دن میں کئی کئی نعتیں لکھنا اور چند ماہ میں سو سے زیادہ نعتوں کا مجموعہ تیار کرکے محفل میں پیش کر دینا خاصا حیرت انگیز واقعہ ہے۔ آخر نبی اکرمؐ کی محبت کے بیج سے پھوٹنے والی شاعری کچھ رنگِ دگر رکھتی ہے۔ خود لالہ صحرائی کا کہنا ہے کہ

> میں نے اپنی تقریباً تمام نعتیں بے اختیاری کے عالم میں لکھی ہیں --- اکثر الفاظ میرے قلب کی حقیقی واردات ہیں نہ کہ خیال کی جولانی یا الفاظ کی مینا کاری کا نتیجہ!

تمہ کے عنوان سے چوبیتی ہے:

اک نعتِ مسلسل ہے مری روح پہ طاری
جب سے کہ ہوا ہوں میں فقط نعتیہ شاعر
یہ سب مری نعتیں ہیں اسی نعت کے ٹکڑے

اس نعت کا مقطع میں کہوں گا دمِ آخر

یہ مجموعہ "نسخۂ قرارِ جاں" کیوں قرار دیا گیا ہے اس لئے کہ خالی خولی قصیدہ و مدحت کی بات نہیں بلکہ

مدحت بھی سعادت ہے، مگر رشتۂ طاعت
پیوند کرے گا مجھے آقا کے لوا سے

مدحت سے کہیں بڑھ کے ہے طاعت کا قرینہ
آؤ کہ چلیں آقا کے ہم نقشِ قدم پر

ترجمان میں شعری مجموعوں کے تبصروں کا حق ادا نہیں ہو پاتا ہے، کیونکہ نہ تو منتخب اشعار پیش کرنے کے لئے جگہ ہوتی ہے اور نہ خاص خاص تاثرات کو بیان کیا جا سکتا ہے۔

کتاب کے شروع میں احمد ندیم قاسمی، مشفق خواجہ اور جناب صلاح الدین کے تقریظی مضامین ہیں۔ اول تو نعتوں کا مجموعہ ایسے تکلفات سے بالاتر ہے، دوسرے اپنے حالیہ انٹرویو جنگ (جس کا خلاصہ سامنے آیا ہے) میں احمد ندیم قاسمی صاحب کی جو تصویر سامنے آئی ہے اس نے تو ان کی شاندار انسان نوازی اور علمی برتری اور ادبی وسعتِ نظر کے متعلق ہمارے تمام حسنِ ظن ختم کر دیئے ہیں۔ اس شخص نے جس خوبصورتی سے اپنی حقیقت کو مستور رکھنے کے لئے طرزِ بیان، موضوعات اور نعت گوئی تک کے کمالات سے فائدہ اٹھایا ہے اس کے بعد مجموعہ ہائے نعت تک کے لئے اسی درگاہِ عالی میں حاضری دینا کہ وہ چار لفظ بطور سند لکھ دیں، توہینِ نعت و نبوت ہے۔ لالہ زارِ نعت لکھ کر یا پڑھ کر اس جانب دوستی کا قبلہ بنا رہے تو کوئی کیا کہے!

آئندہ ایڈیشن کو "لالہ زارِ نعت پر اک طائرانہ نظر" سے محفوظ ہی رکھیے تو اچھا ہے۔

وطن کا قرض: از قیصر قصری، نثار احمد زبیری، نورالعین نوید (مرحوم)۔ منتخب افسانوں کا مجموعہ۔ صفحات ۳۲۰ سفید کاغذ پر باریک لکھائی، جلد پر رنگین سرورق۔ قیمت ۱۰۰ روپے۔

نورالعین نوید دراصل اس ایوانِ ادبیات کے اصحابِ ثلاثہ کی روح و رواں تھے، جنہوں نے کتب و رسائل سے بے شمار افسانے جمع کئے، جن کی صفت سرورق پر یہ درج ہے کہ "وطن کی خوشبو میں ڈوبے ہوئے افسانے" مزید یہ کہ جو پاکستان سے محبت اور اس کے لئے کچھ کرنے کا

جذبہ رکھتے ہوں ...... مجموعی تاثر مثبت ہو' مایوسی یا بددلی پیدا نہ کرتا ہو۔

اس انتخاب کا دائرہ ۱۹۴۵ء سے ۱۹۹۰ء تک کا زمانہ ہے۔ اور کسی گروہ بندی کا خاص لحاظ نہیں رکھا گیا۔ غلام عباس کا نام سب سے پہلے ہے' سعادت حسن منٹو بھی موجود' الطاف فاطمہ' احمد ندیم قاسمی' آثم مرزا' مسعود مفتی' غلام محمد' انتظار حسین' انور عنایت' غلام الثقلین نقوی اور دوسرے متعدد نام شریکِ مجموعہ ہے۔

مسعود مفتی کے افسانے میں بنگلہ دیش کے حالات کی بڑی حقیقت نگاری ہے' خصوصاً تعلیم کے راستے سے کس طرح نقب لگائی گئی۔ کاش کہ کوئی صاحب "بنگلہ دیش کے بننے میں نظامِ تعلیم کا حصہ" پر اس کی روشنی میں مضمون لکھیں' یا اسی کتاب کی متعلقہ عبارت کو نقل کر کے شائع کر دیں۔

ان افسانوں میں بعض کا تعلق ۱۹۴۷ء کی داستانِ خونیں سے ہے' بعض کا بنگلہ دیش کے سانحہ سے' بعض کا جہادِ ستمبر ۶۵ء سے اور بعض خود پاکستان کے اندر ہی نشوونما پاتے ہیں۔

لسانیت' صوبائیت اور زمین پرستی کے افتراق انگیز اور تصادم انگیز فاسد نظریات کے خلاف ان افسانوں میں بڑا لطیف مواد بھرا ہوا ہے۔

افسوس کہ ایوانِ ادب کے درویشوں سے ایک اس کتاب کی اشاعت کے بعد چل بسا' یعنی نورالعین نوید۔ خدا مغفرت کرے۔

درونِ روس: از حکیم محمد سعید صاحب ۔ ناشر: ہمدرد فاؤنڈیشن پریس۔ ناظم آباد' کراچی ۷۴۶۰۰۔ عمدہ کاغذ و طباعت' نفیس جلد بندی' صفحات ۳۶۰' قیمت ۱۲۵ روپے۔

حکیم محمد سعید صاحب کے بیک وقت تگ و تاز کے کئی میدان ہیں جن میں ان کی قلمرانی کی تاخت و تاراج کا وسیع دائرہ بھی ہے اور پھر اس دائرے میں ایک اور دائرہ سفرنامہ نگاری کا ہے۔ سفرنامہ نگاری کے اس دور میں جبکہ اس شعبے کی رنگارنگ اصناف نمودار ہو چکی ہیں' کمال یہ ہے کہ حکیم صاحب کا اپنا ایک منفرد انداز ہے۔ اسے آپ حکیمانہ انداز کہہ لیجیے' یا ہمدردانہ انداز یا سعیدانہ انداز۔ پھر رنگ ہے بہت مختلف۔ وہ سفر کرتے ہوئے ساتھ قارئین کو ذہنی سفر بھی کراتے ہیں' جغرافیے اور موسم کے علاوہ تاریخ سے بھی آگاہ کرتے ہیں۔ ضرورت پڑے تو سیاست کو بھی نہیں بخشتے۔ میوزیم اور عجائب گھروں اور مخطوطات اور لائبریریوں کے تو شیدائی ہیں۔

پھر شخصیات اور حلقہ ہائے تعارف کے قدرداں اور نئے رابطے پیدا کرنے کے ماہر۔

اپنی بیگم کے نام سے کتاب کو معنون کرنے کے لئے چند جملے لکھے۔ کتنے دلکش اور دردناک ہیں۔ مثلاً "ان بے چاری کے پاس محبت کے سوا تھا بھی کیا"۔ "میں نے مرحومہ کے لئے کیا کیا"۔ "نعمت بیگم میں شرمسار ہوں"۔ اعلیٰ شریف گھرانوں میں یہی ہوتا ہے کہ خاتونِ خانہ کی طرف سے اتنا ایثار ہوتا ہے کہ تنہا ہو جانے کے بعد مرد اسی احساس میں ڈوب جاتا ہے کہ "میں نے کیا کیا۔ میں شرمسار ہوں"۔

کتاب کے ساتھ مکتوب میں لکھا کہ ریگن گورباچوف ملاقات میں سرفہرست یہ نکتہ رہا ہے کہ کرۂ ارض پر مسلم طاقتوں کی بیداری اور عروج کی مساعی کو دبا دیا جائے۔ آخر میں لکھا ہے کہ اس کتاب سے میرا مقصد یہ ہے کہ (روس سے) خارجہ تعلقات کی استواری کی فکر کی جائے۔

پھر لکھا ہے کہ یہ خطرہ یہاں محسوس کیا جا رہا ہے کہ آج سے ۱۵-۲۰ سال بعد مسلمان اکثریت میں ہو جائیں گے (ص ۴۱)۔ خیال رہے کہ آبادی کا تعلق ملکی اور بین الاقوامی سیاست سے بھی ہے۔ صرف روٹی سے نہیں۔

سفرِ روس ۱۹۸۹ء میں کیا گیا۔ ۱۹۹۰ء میں یہ کتاب لکھی گئی اور ۱۹۹۱ء میں شائع ہوئی۔ حیرت ہوتی ہے کہ حکیم سعید صاحب نے ۱۹۸۹ء کے مطالعۂ روس ہی میں وہ انجام دیکھ لیا جو ۱۹۹۱ء میں سامنے آیا (ص ۴۷) نظریات لینن شکست کھا جائیں گے (ص ۴۸) اسلام کو "تہذیب ساز مذہب" کہہ کر اس کی تین صفات بتائی ہیں: (۱) انسان دوستی (۲) تہذیب سازی (۳) ہم زیستی۔ روسی وزارتِ خارجہ کے وی پیروف سے حکیم صاحب کی بہت مفصل گفتگو روس، افغانستان، پاکستان اور امریکہ کے موضوع پر ص ۷۸ سے شروع ہو کر چند صفحات تک جاتی ہے۔ روسی فوج کا حالِ زار (۹۳-۹۴) پر ملاحظہ فرمایئے۔

اب سفرنامے کا دوسرا دریچہ کھولتے ہیں۔ البیرونی انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز تاشقند میں حکیم صاحب نے اچھا خاصا وقت گزارا۔ عمارت اور لائبریری کا قصہ تو بجائے خود دلچسپ ہے ایک لاکھ کتابوں کے ساتھ کوئی ۲۰ ہزار مخطوطات کا خزانہ محفوظ ہے۔ "میں ان کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کیا سلیقہ ہے۔ کیا علم کی قدر ہے، سبحان اللہ!" مالی مشکلات کے باوجود ان مخطوطات پر مبنی گیارہ سو کتابیں انسٹی ٹیوٹ چھاپ چکا ہے۔ دنیا میں کم و بیش ۳۰ لاکھ مخطوطات اسلامی علماء و حکماء کے بنیادی علمی کارناموں کے شاہد ہیں۔ "میں نے یہ مشورہ دیا تھا کہ اگر ۴۲ مسلم ممالک یہ فیصلہ کرلیں کہ وہ ہر سال کم از کم اپنے ۵۰ نوجوانوں کے لئے ڈاکٹریٹ کی تعلیم کا اہتمام کریں

اور ایک ایک مخطوطہ ہر ایک کو ڈاکٹریٹ کے بدلے حوالے کر دیں تو ہر سال سیکڑوں مخطوطات کے مشمولات سامنے آجائیں گے .... میری اس تجویز کا ذرہ برابر نوٹس نہیں لیا گیا۔" (ص ۱۴۳)

صرف ترکی میں ۴ لاکھ مخطوطات موجود ہیں مگر ان سے استفادہ نہیں ہو رہا۔

پھر حکیم صاحب نے ۱۵ ویں صدی ہجری کا آغاز کھوکھلے جشنوں سے کرنے کے بجائے تجویزیں دیں مگر وہ بھی نہ چل سکیں۔ ایک تجویز یہ تھی کہ اسلام کی پہلے سے شائع شدہ اہم کتب میں سے ایک سو کا انتخاب کریں جو مختلف علوم و فنون کے متعلق ہوں اور دس بارہ اہلِ علم کو وظائف دے کر ان کے انگریزی ترجمہ کی مہم میں لگا دیں۔ منصوبہ "ایک سو کتابیں" کا کام شروع بھی ہوا مگر پھر تا ئیں تا ئیں فش!

جناب یہ قوم ٹھہراؤ اور جماؤ کے ساتھ کسی ٹھنڈے یا لمبے منصوبے پر کام کرنے کی اہل نہیں!

یہ تو دو ایک نمایاں باتیں سامنے آگئیں۔ حکیم صاحب تو قارئین کو سیر بہت کراتے ہیں' مناظر دکھاتے ہیں' ضیافتوں میں شریک کرتے ہیں جہاں کھانا تو نہیں ملتا' البتہ بہت سے تعارف اور بہت سی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں۔

کتاب کا مقصدِ مضمر روس کے اشتراکی نظام کی شکست و ریخت سے پہلے یہ تھا کہ پاکستان کو روس کی جانب بھی تعلقات استوار کرنے کی فکر کرنی چاہیے۔ اور اب جبکہ روس میں سیاسی و معاشی انہدام واقع ہوا ہے' ہمیں روس سے بھی خیر سگالی کی راہیں نکالنی چاہئیں اور علی الخصوص آزاد مسلم ریاستوں سے نہایت گہرے روابط استوار کر کے انھیں اسلام کی ابجد سے لے کر اسلام کے نظامِ حیات اور اس کے طریقِ انقلاب تک ہر پہلو سے انھیں تعلیم اور مشورے دینے چاہئیں۔ بلکہ اقتصادی لحاظ سے غیر معمولی توجہ کرنی چاہیے۔

تاجدارِ حرمؐ: از جناب اثر فاضلی۔ ناشر: ادارۂ فکر و نظر' ۱۰/۸ A بلاک ایل' نارتھ ناظم آباد' کراچی۔ کاغذ سفید۔ صفحات ۳۴۳۔ مجلد مع رنگین گرد پوش۔ قیمت ۶۰ روپے۔

عقیدۂ اتباعِ اسوۂ رسالتؐ اور جذبۂ حبِ نبیؐ کے زیرِ اثر سیرتِ محمدیہؐ پر ہر سال کئی کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ اور یہ اچھا ہے کہ نبیؐ آخر الزماں کے بارے میں بار بار لٹریچر نمودار ہوتا رہے۔

اثر فاضلی صاحب نے آیات و احادیث درج کر کے متعلقہ احوال و واقعات بیان کئے ہیں اور

بڑے اختصار سے سیرت کے مناظر پیش کر دیے ہیں۔ دراصل مؤلف نے "ابلیسیاتِ رُشدی" کو پڑھ کر قلم اٹھایا اور حضورؐ کی عائلی زندگی اور ازواج مطہرات پر جو خرافاتِ غیر راشدانہ سامنے آئیں ان کا رَد کرنے کے لئے "پردہ نشینانِ حرم" کے عنوان سے ایک مستقل باب قلم بند فرمایا جو ۱۷۹ صفحات پر مشتمل ہے۔

امید ہے کہ ان کی خدمت کو قبولِ عام حاصل ہو گا۔

اسماعیل میرٹھی: از جناب حکیم نعیم الدین زبیری۔ ناشر: ہمدرد فاؤنڈیشن' ہمدرد سینٹر' ناظم آباد' کراچی۔ اچھے نیوز پیپر پر حسنِ طباعت کے ساتھ' ۲۲۷ صفحے کی یہ کتاب' ۲۵ روپے میں ملتی ہے۔ رنگین سرورق پر مولانا اسمٰعیل میرٹھی کی بڑی صاف تصویر ہے۔

"جاگو اور جگاؤ" کے طغریٰ کے ساتھ "نونہال ادب" کا شعبہ ہمدرد سینٹر نے اس لئے قائم کیا ہے کہ اس کے ذریعے بچوں کے لئے آسان' دلچسپ اور سستا لٹریچر شائع کیا جائے۔ بچوں کے وسیع حلقے میں دینی' علمی' معلوماتی' تفریحی' سائنسی' منظومات' ہر قسم کی سلیس کتابوں کی ضرورت ہے۔ اس عمر میں کہانیاں' اشعار' لطیفے بڑی اہمیت رکھتے ہیں' مگر بامقصد اہلِ قلم ان پیرایوں میں دینی اور سائنسی اور تہذیبی ہر طرح کی معلومات دیتے ہیں۔ افسوس ہے کہ نو عمر قارئین کی کثیر تعداد کی مانگ پورا کرنے کے لئے ادارے اور مصنفین ناکافی ہیں۔ ایسے حالات میں "نونہال ادب" کا ہم دلی خیر مقدم کرتے ہیں جس کی طرف سے کئی نہایت ہی مفید اور مشہور کتابیں آچکی ہیں۔

مولانا اسمٰعیل میرٹھی بچوں کے شاعر تھے اور انہوں نے بڑی دلچسپ نظمیں لکھی ہیں جو بامقصد بھی ہیں' نری "ٹوٹ بوٹ" ہی نہیں ہیں۔ اس کتاب میں ۷۸ نظمیں ہیں جن میں سے آخری عنوان متفرق اشعار کا ہے۔

برسوں پہلے ہم نے بھی مولینا کی نظمیں پڑھی تھیں۔ اب اکا دکا مصرع یاد آجاتا ہے۔ مثلاً "اٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں" (صبح) یا "مئی کا آن پہنچا ہے مہینہ۔ بہا چوٹی سے ایڑی تک پسینہ"۔ اور "ایک لڑکی بگھارتی ہے دال۔ دال یوں عرض کرتی ہے احوال"۔ "خدا کی حمد" سے لے کر "ہوا اور سورج کا مقابلہ" "قوسِ قزح" "کیڑا" "مور اور ملنگ" "ایک جگنو اور بچہ" "چھوٹی چیونٹی" اور "تاروں بھری رات تک" رنگ برنگے مضمون دلچسپیاں لئے پڑھنے والے

بچوں کے منتظر ہیں۔ ہر نظم کے بعد مشکل الفاظ کے معنی درج کیے گئے ہیں۔

حکیم نعیم الدین زبیری صاحب نے تاریخی پس منظر بیان کرکے سمجھ دار بچوں کے لئے بہت مفید کام کیا ہے۔ انھوں نے کچھ باتیں الفاظ اور تلفظ کی بھی کی ہیں۔

اندرونی سرورق کے دوسرے صفحے پر لکھا ہوا ہے کہ نونہال ادب کی کتابیں "نہ نفع نہ نقصان" کی بنیاد پر شائع کی جاتی ہیں۔ یہ بچوں کے لئے محبت وہمدردی کا اچھا نمونہ ہے۔

بقیہ: امام ربیع بن صبیح بصری

۵۔ خلاصہ تذہیب الکمال ص ۱۱۵

۶۔ کتاب الجرح والتعدیل ج ۱ ص ۴۶۵

۷۔ تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۲۴۸

۸۔ ایضاً

۹۔ کشف الظنون جلد ۱ ص ۳۴۳

۱۰۔ مقالات سلیمان جلد ۲ ص ۴

۱۱۔ شذرات الذہب جلد ۱ ص ۳۰۹

۱۲۔ شذرات الذہب جلد ۱ ص ۳۰۹

ہمارے تازہ کیسٹ

● اجتماع ۶۳ کی صوتی رُوداد :

سید مودودیؒ کے دونوں خطاب، خورشید احمد کی تقریر اور ماہر القادری کا منظوم تاثر۔

● قرآن اور ہم :

خرم مراد کا ملتان میں حیا آفریں خطاب۔ سیرت النبیؐ کا پیغام۔ قرآن کو اختیار کرو فلاح پا جاؤ گے۔

● کیسٹ ڈائجسٹ ۳ :

بچوں کے لیے کہانیاں، لطیفے، نظمیں، چٹکلے۔

● ایک خدا۔ ایک اُمت :

توحید اور رسالت کے عقائد پر سید مودودیؒ اپنے مخصوص، دھیمے لیکن بہا لے جانے والے انداز میں استدلال پیش کرتے ہیں۔ ۳۰ برس قبل کی بالکل صاف آواز۔

● خدمتِ انسانیت :

خدمت بھی دعوت کا ایک اُسلوب ہے اور ایمان کا تقاضا بھی! ۔ خرم مراد سے سُنیے

۔ تحریکی مکتبوں سے حاصل کیجیے یا ہمیں لکھیے :

سمع و بصر

۱۸۔ امبر موٹل۔ نرسری، کراچی۔ ۷۵۴۰۰

فون : ۱۸۔ ۴۳۱۱۵۹